ماہنامہ

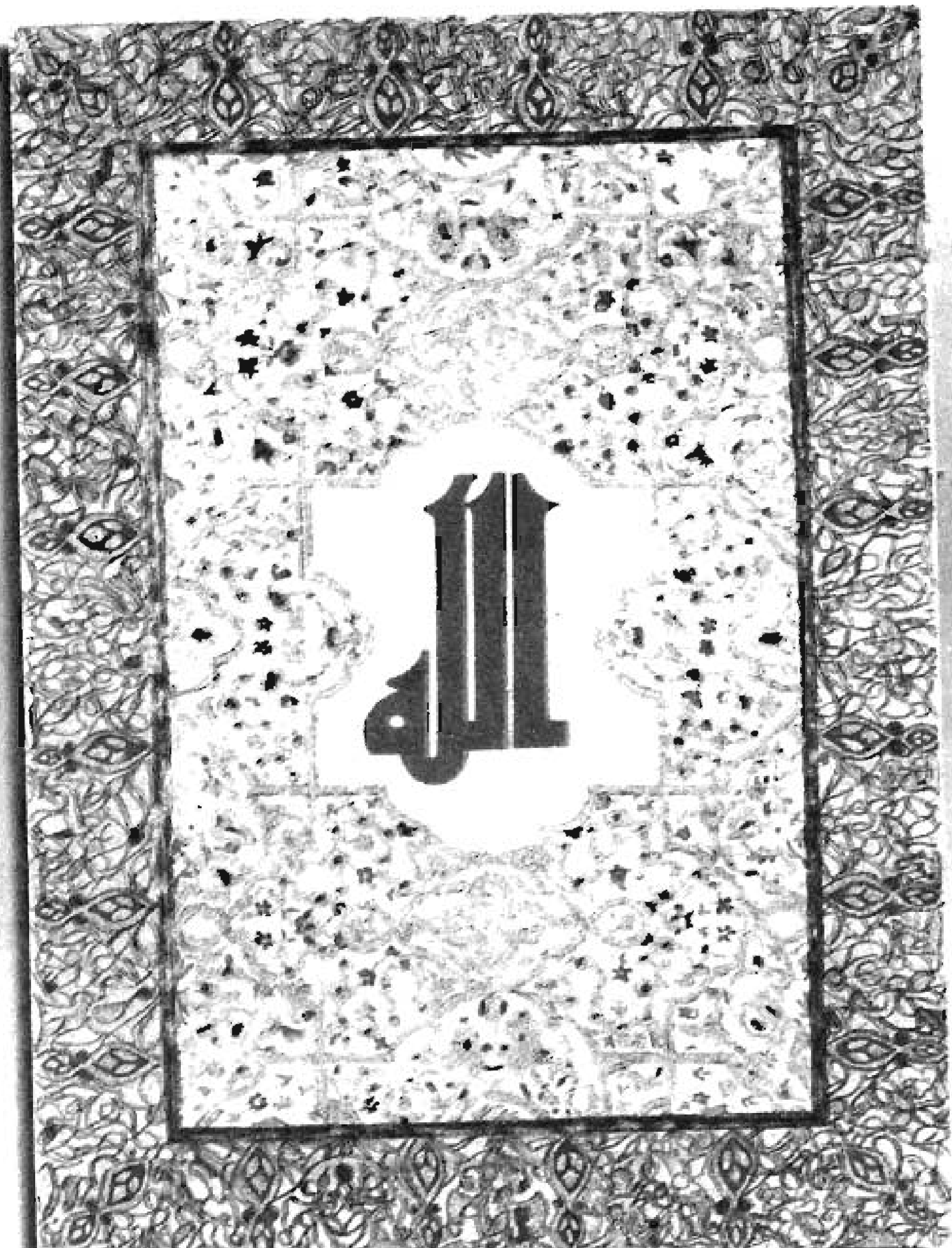
ترجمان القرآن

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مُدیر

خورشید احمد



ماہنامہ

ترجمان القرآن

اعزازی

مدیر: خورشید احمد　　　　نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۳　　　　مارچ ۱۹۹۷ء، ذیقعدہ ۱۴۱۷　　　　عدد ۳

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۲۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

مشرق وسطی ۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط ۴۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

٦٠ سال پہلے

یورپ کی تہذیب مشرقی ممالک پر جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قابض ہوتی چلی جا رہی ہے' ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں اور اس کے جو مضر اثرات پیدا ہو رہے ہیں' وہ بھی محتاج بیان نہیں۔ مشرق کا مذہب اور اس کا تمدن دونوں مساوی طور پر اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی کا یہ کس قدر افسوسناک مظاہرہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے بجائے خود اپنے ہی کو غیروں کے رنگ میں رنگتے جا رہے ہیں۔ اور اسلامی تہذیب و معاشرت کو چھوڑ کر نہ صرف اپنی سیزدہ صد سالہ روایات کو محو کر رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایمان اور اسلام کی بھی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ہماری تہذیب اور ہمارا مذہب ہے جس کے بند میں شگاف پر شگاف پڑتے جا رہے ہیں' دوسری طرف تہذیب مغربی کا سیلاب ہے جو ان شگافوں میں سے روز افزوں تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ مغربی فتنہ اپنی گوناگوں زینتوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اسلامی ماحول میں ایک وبا کی طرح پھیل جاتا ہے۔

ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک اور روح اسلام کو پیام ہلاکت دینے والا فتنہ "مغربی حسن" ہے۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مغربی ساحرات اپنی ایمان سوز ادائیں لے کر ساحل ہند پر اترتی ہیں اور ملک کا "تعلیم یافتہ" اور "مہذب" طبقہ اپنی متاع جان و ایمان لے کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ یہ بے پناہ طوفان یورپین فتوحات کا ایک زبردست حربہ ہے جس کی طرف اگر ہمارے ارباب حل و عقد اور ملی رہنماؤں نے پوری توجہ نہ کی تو انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ اسلامی تاریخ کے آیندہ صفحات میں وہ ایک افسوسناک باب کا اضافہ کریں گے۔

--- سیاسی اور قومی مصالح کسی طرح اس موالات اور اختلاط کی اجازت نہیں دیتے بالخصوص اس زمانے کے لیے جبکہ ایمان کی بنیادیں دن بدن کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں اور مسلمانوں کا دین و اسلام حوادث روزگار کے بے پناہ سیلاب میں حباب کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے اور مغرب کی مطلق العنان تہذیب کی ہر صدا پر اسلام کی روح قربان کی جا رہی ہے۔ اس خطرناک فتنہ کو دیکھ کر دردمند مسلمانوں کو کبھی بھی خاموش نہ بیٹھنا چاہیے۔ یہ نرے الفاظ نہیں بلکہ حقیقت اور تجربہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہزارہا نوجوان اور ان کے واسطے سے ان کے خاندان اسلام سے اور اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور یہ غارت گران دین و ایمان نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی سحر آفرینیوں کے ذریعے مسیحی مشن کو کامیاب بنا رہی ہیں۔

(مولانا صدر الدین اصلاحی: نکاح کتابیہ' جلد ١٠' عدد ١' مارچ ١٩٣٧' محرم الحرام ١٣٥٦)

3

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

احتساب اور صحیح قومی ترجیحات کا چیلنج

خورشید احمد

افراد کی طرح قوموں کی زندگی میں بھی کچھ بڑے ہی نازک لمحات آتے ہیں جن کے بارے میں صحیح اور بروقت فیصلہ تاریخ کے رخ کو تبدیل کر سکتا ہے اور غفلت یا غلط فیصلہ سارے امکانات کو خاک میں ملا دیتا ہے اور برسوں کے لیے راہ کھوٹی ہو جاتی ہے!

۳ فروری ۱۹۹۷ کے انتخابات کے بعد پاکستانی قوم' اس کی سیاسی اور معاشی قیادت اور خود تحریک اسلامی' کا سابقہ بھی ایک ایسے ہی تاریخی لمحے سے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ملکی اور بین الاقوامی تناظر میں یہ انتخابی نتائج' عالم الغیب والشہود کی طرف سے جہاں بیدار کرنے والا ایک تازیانہ ہیں وہاں اب بھی سنبھل جانے اور صحیح خطوط پر مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک اور موقع بھی۔ یہ اس کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے پچاس سال پہلے ۲۷ رمضان المبارک کو وجود میں آنے والے پاکستان کو اس کی ساری کوتاہیوں اور ناکامیوں کے باوجود اس سال رمضان المبارک کے آخری عشرے میں منعقد ہونے والے انتخابات اور اس کے نتائج کی شکل میں غور و تدبر اور عزم و انصرام کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا ہے' جسے سطحی انداز میں ضائع بھی کیا جا سکتا ہے اور گہرے غور و فکر اور تجزیہ و تحلیل کے ذریعے اس سے مناسب عبرت بھی لی جا سکتی ہے اور آیندہ کے لیے صحیح اہداف اور ترجیحات کا تعین اور ایک حکمت عملی کی ترتیب کا کام بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ماضی پر تدبر کی نگاہ ڈالنا مفید ہو سکتا ہے۔ اکیاون سال پہلے' ۱۹۴۶ کے تاریخی انتخابات میں ووٹوں کے ذریعے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کو ایک ایسا ہی موقع دیا گیا تھا جسے قائداعظم نے اپنی فراست سے قیام پاکستان کے لیے بڑی دانش مندی سے استعمال کیا لیکن ان کی وفات کے بعد مسلم لیگ کی قیادت نے اللہ تعالیٰ اور مسلمان قوم سے کیے ہوئے وعدوں اور وقت کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا جس کے نتیجے میں دستور ساز اسمبلی کی تحلیل اور ۱۹۵۴ میں مشرقی پاکستان' پھر ۱۹۷۰ میں دونوں صوبوں میں مسلم لیگ کو ایسی ہی شکست سے دوچار ہونا پڑا جیسی شکست ۱۹۹۷ میں پی پی پی کا مقدر بنی! برصغیر میں ایسی اور بھی مثالیں ہیں جہاں تاریخی مواقع کو نشانات عبرت بننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ شیخ مجیب الرحمٰن' اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کی

انتخابی فتح و شکست میں بھی ایسی ہی نشانیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس لیے ہماری نگاہ میں یہ وقت نہ کچھ کے لیے صرف سر پیٹنے اور مایوسی کا شکار ہونے کا ہے اور نہ کچھ دوسروں کے لیے محض فتح کے شادیانے بجانے اور تحیات اور خوش آمدانہ تبریکات کے تبادلے کا ہے' بلکہ سب کے لیے غور و فکر' تحلیل و تجزیہ اور احتساب اور نئے چیلنجوں کا سنجیدگی سے جواب تلاش کرنے کا ہے تاکہ آنے والی صدی' جس کی دہلیز پر آج ہم کھڑے ہیں' گزرے ہوئے برسوں سے مختلف ہو سکے اور ماضی کی غلطیوں سے بچتے ہوئے ایک روشن مستقبل کی تعمیر ممکن ہو سکے:

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

---

۳ فروری کے انتخابات کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ یہ انتخابات عام حالات میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی مدت کی تکمیل کی بنا پر منعقد نہیں ہوئے۔ ان کی تو ایک خاص شان نزول ہے جو ایک طرف سابقہ حکومت کی بدعنوانیوں' بے قاعدگیوں' ظلم کاریوں اور دستور اور قانون کی بے محابا خلاف ورزیوں کے باعث صدارتی احکام کے تحت برطرفی سے عبارت ہے تو دوسری طرف صدر محترم اور عبوری حکومت کے بے لاگ احتساب اور شفاف انتخابات کے وعدوں اور ان کی بنا پر رونما ہونے والی توقعات سے۔ انتخابی نتائج کا انھی دونوں پہلوؤں کے پس منظر میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے نیز جن پر نئی ذمہ داری پڑی ہے ان کی کارکردگی بھی انھی چیلنجوں کی کسوٹی پر پرکھی جائے گی۔

حالات کے معروضی جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ملک کا عام شہری مفاد پرستانہ اجتماعی نظام' بدعنوان سیاسی قیادت' مفلوج نظام احتساب اور تباہ کن معاشی صورت حال کا ستم زدہ ہے جو ان حالات سے سخت بے زار ہے۔ تقریباً ستر فی صد ووٹروں کا حق رائے دہی استعمال نہ کرنا جو ماضی کے کم سے کم تر رائے دہی (turn up) سے بھی اوسطاً" پانچ فی صد کم اور ۱۹۹۳ میں ووٹ کا حق استعمال کرنے والوں اوسطاً" تیرہ فیصدی کم ہے۔ بلاشبہ انتخابی نتائج کو جیسے بھی وہ ہیں' تسلیم کرنا چاہیے اور جیتنے والوں کو اپنے وعدوں کے مطابق کام کرنے کا مناسب موقع ملنا چاہیے لیکن کسی کی طرف سے بھی زمینی حقائق کو نظرانداز کرنا بے حد خطرناک اور صحیح اور حقیقت پسندانہ پالیسی سازی کے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم اس بات کو اولین حقیقت کے طور پر اس لیے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ سیاست دان اور ان کے ہم نوا کالم نگار ان حقائق سے توجہ ہٹانے اور ایک مصنوعی ذہنی فضا (make believe world) بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو نئی پارلیمنٹ کے ارکان اور سیاسی قیادت کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ ان کو اس طرح کے جھوٹے طلسم کے

زیر اثر لانے کا باعث ہو گا جو آج تک کی قیادتوں کو گمراہ کرتا رہا ہے۔

انتخابات کا دوسرا قابل غور پہلو پیپلز پارٹی اور بے نظیر صاحبہ کی قیادت پر عوام کے تاریخی عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ قوم نے اس پارٹی کو تین بار موقع دیا اور تینوں بار اس نے اسے مایوس کیا اور نہ صرف یہ کہ ان وعدوں سے بے وفائی کی جو عوام سے کیے گئے تھے بلکہ محض اپنے ذاتی اقتدار اور ذاتی منفعتوں کی خاطر قوم و ملت کے ہر مفاد کو قربان کیا اور ملک کو تباہی کے سرے پر پہنچا دیا۔ عوام نے تو اپنی مایوسی اور بے زاری کا اظہار اس تحریک احتساب ہی میں کر دیا تھا جس کے نتیجے میں صدر مملکت کو ۵ نومبر ۱۹۹۶ کو پی پی پی کی حکومت کو برطرف کرنا پڑا۔ پھر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے ان وجوہ کی توثیق ۲۹ جنوری ۹۷ کے اپنے عبوری فیصلے میں کر دی جن پر حکومت کو برطرف کیا گیا تھا اور بالاخر ۳ فروری کے انتخابات' رائے عامہ کی طرف سے اس پارٹی اور اس کے انداز حکمرانی کے خلاف ایک ملک گیر استصواب بن گئے۔ یہ فیصلہ صرف عام شہریوں ہی کا نہیں بلکہ ان ووٹروں کا بھی ہے جنھوں نے اس سے پہلے ۱۹۷۰' ۱۹۸۸' ۱۹۹۰ اور ۱۹۹۳ میں پی پی پی کو پارلیمنٹ اور اقتدار تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس انتخاب کے موقع پر عوام نے یہ پیغام دے دیا ہے کہ کسی بھی جماعت کو ووٹروں کو اپنے مزارع اور تابع مہمل نہیں سمجھنا چاہیے۔

ان انتخابات کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ووٹروں نے نظام حکمرانی اور قیادت کے بارے میں اپنی تمام مایوسی اور بے زاری کے باوجود مسلم لیگ اور خصوصیت سے اس کی مرکزی قیادت کو ایک نادر موقع دیا ہے۔ ۱۹۵۴ کے بعد مسلم لیگ کو پہلی بار ملک کے تمام صوبوں میں ایک فیصلہ کن پوزیشن حاصل ہوئی ہے۔ اب اگر وہ جرات اور بالغ نظری سے معاملہ کرے تو اپنے وعدوں کے مطابق ضروری دستوری ترامیم' متعلقہ قانون سازی' بجٹ سازی اور سیاسی اور اجتماعی فیصلے کر سکتی ہے۔ یہ پوزیشن ایک تاریخی موقع اور ایک فیصلہ کن آزمایش ہے۔ اگر مسلم لیگ کی قیادت خلوص اور ایمانداری کے ساتھ صحیح مقاصد اور اہداف کا تعین کرتی ہے اور مفاد پرستی اور اقربا نوازی کی سیاست کو چھوڑ کر ملک و ملت کی خدمت کرتی ہے تو وہ نئی صدی میں پاکستان کے استحکام اور ترقی کے باب میں گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہے اور اگر وہ اس نادر موقع کو حسب سابق ضائع کر دیتی ہے تو اس کا حشر بھی پی پی پی کے انجام سے مختلف نہیں ہو گا۔

ہمیں توقع ہے کہ نئی پارلیمنٹ اور نئی حکومت کے اولین چند ماہ ہی میں ہوا کا رخ پوری طرح معلوم ہو جائے گا اور قوم یہ جان سکے گی کہ ماضی سے کوئی سبق سیکھا گیا ہے یا نہیں۔ چونکہ پاکستان اس وقت بڑے ہی سخت حالات سے دوچار ہے اور اس کے دشمن' ملک میں بھی اور ملک کے باہر بھی' اسے خاکم بدہن "ایک ناکام ریاست" قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں' اس لیے ہم ان حالات میں اپنے سارے اختلافات اور خدشات کے باوجود اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتے ہیں کہ وہ ارباب سیاست کو صحیح فیصلے کرنے اور ملک عزیز کی بقا و استحکام کے لیے درست پالیسیاں اختیار کرنے کی توفیق بخشے اور یہ مظلوم قوم ذہنی انتشار' اخلاقی بگاڑ' سماجی بحران اور معاشی بدحالی کی اس دلدل سے نکل کر شاہ راہ ترقی پر گامزن ہو کر اپنی اصل منزل کی طرف پیش رفت کر

سکے۔ ہمارے پاس مہلت کی گھڑیاں بڑی کم ہیں اور قومی وسائل کا جو محدود سرمایہ باقی رہ گیا ہے' وہ مزید تجربات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پوری دیانت اور صاف گوئی کے ساتھ ان مسائل اور چیلنجوں کی نشاندہی کریں جو اس وقت ملک و ملت کو درپیش ہیں اور جن کے بارے میں صحیح منصوبہ بندی اور موثر اقدام ہی پر مستقبل کا سارا انحصار ہے۔

جن امور کی اوپر نشاندہی کی گئی ہے وہ تو بدیہی حقائق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ان انتخابات کو ایک وارننگ تصور کیا جائے اور ان کے اصل پیغام کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے۔ یہ بڑی کوتاہ نظری ہوگی کہ اس آئینہ میں محض ایک پارٹی کی شکست اور ایک پارٹی کی فتح کی تصویر دیکھی جائے اور نتائج کے خطوط خم دار سے جو اصل پیغام سامنے آتا ہے اور جو ووٹ دینے والوں اور ووٹ نہ دینے والوں دونوں کی مشترک خواہش کا عکاس ہے' اسے پس پشت ڈال دیا جائے۔ ہماری نگاہ میں یہ پیغام اولاً احتساب کی ناقابل انکار ضرورت اور ثانیاً قومی زندگی اور کاروبار سیاست و معیشت میں بنیادی تبدیلی کی زبردست خواہش سے عبارت ہے۔ چونکہ مستقبل کا فیصلہ انھی دو امور کے بارے میں صحیح اقدامات پر منحصر ہے' اس لیے ہم ان دونوں کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

تاریخ کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کامیاب قومیں وہ ہیں جو صحیح مقاصد اور وسائل کے مناسب استعمال کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر موثر احتساب کا نظام قائم کرتی ہیں' اسے ہر لحہ جاری و ساری رکھتی ہیں اور اس بارے میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیتیں۔ اسلام نے عبادت سے لے کر اجتماعی معاملات تک ایمان اور احتساب کو مرکزی اہمیت دی ہے اور امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک ایسا نظام قائم کیا ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف افراد امت کے لیے آزادی اور اصلاحی کوششوں کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں تو دوسری طرف سربراہ مملکت سے لے کر ایک عام شہری تک ہر ایک کے لیے احتساب کا کھلا نظام قائم کیا ہے۔ بلکہ صحیح تر بات یہ ہوگی کہ جو ذہن اس امت کے افراد میں پیدا کیا گیا ہے اس کی ایک نمایاں ترین خصوصیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں حاسبوا قبل ان تحاسبوا (اپنا احتساب کرو قبل اس کے کہ تمھارا احتساب کیا جائے) ہی ہے۔ گویا اس نظام کے بنیادی ستون خود احتسابی اور اجتماعی احتساب ہیں۔ احتساب کا یہ عمل اس دنیا میں شروع ہوتا ہے لیکن اس کی تکمیل آخرت کی زندگی میں ہوتی ہے جس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اور "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں شیطان اس امت کی جس صلاحیت سے سب سے زیادہ خوف زدہ نظر

آتا ہے' وہ اس کی احتساب ہی کی صلاحیت ہے:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

پاکستان کی تاریخ کا ایک ایک دن گواہ ہے کہ ہمارے زوال اور انتشار کی بنیادی وجہ احتساب سے اغماض اور فرار ہے۔ پہلے وزیراعظم کا قتل ہو یا دوسرے وزیراعظم کی برطرفی اور دستور ساز اسمبلی کی تحلیل' دستور کی تنسیخ ہو یا کشمیر پالیسی کا دیوالیہ پن' انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار ہو یا اپنے ہی عوام کے خلاف فوج کشی' نصف ملک کا کھو دینا ہو یا علاقائی اور فرقہ وارانہ منافرتوں کی ترویج' صنعتی اور تجارتی لائسنسوں کی تقسیم ہو یا قومی اراضی کی بندر بانٹ' کوآپریٹوز کا اسکینڈل ہو یا بنکوں کو لوٹنا' کمیشنوں کا کاروبار ہو یا رشوت کی فراوانی اور اختیارات کا غلط استعمال --- ہر مجرم اور لٹیرا احتساب سے بچا رہا اور قوم کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ ایک طرف چند ہزار خاندان امیر سے امیر تر ہوتے گئے اور ان کے لیے ملک اور ملک سے باہر عیش و عشرت کا ہر سامان ارزاں ہو گیا اور دوسری طرف غریب غریب تر ہوتے گئے اور آبادی کا تقریباً چالیس فی صد زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو گیا' صنعتیں بند ہونے لگیں' بنک دیوالیہ ہو گئے' ملک کی بین الاقوامی ساکھ خاک میں مل گئی اور اس کے ماتھے پر دنیا کے دوسرے بدعنوان ترین ملک کا داغ لگ گیا۔ نیز قوم اور اس کی آنے والی نسلیں ملکی اور بیرونی قرضے کے بوجھ تلے اس طرح دب گئیں کہ ہر مرد و زن اور بوڑھا اور بچہ پندرہ ہزار روپے کا مقروض ہے اور قوم پر اس وقت ۹۰۰ ارب روپے سے زیادہ کا ملکی قرض اور تقریباً چالیس ارب ڈالر کے بیرونی قرض کا پہاڑ مسلط ہے۔ سرکاری اندازوں کے مطابق صرف گذشتہ تین سالوں میں سالانہ قومی دولت کا ۲۰ سے ۲۵ فی صد کرپشن کی نذر ہوا ہے جو چار ساڑھے چار سو ارب روپے سے متجاوز ہے۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں ملک کا بچہ بچہ پکار رہا ہے کہ وقت کی سب سے اہم ضرورت احتساب ہے تاکہ ہر سیاسی وفاداری سے بلند ہو کر ہر اس شخص کی گرفت ہو سکے جس نے قومی دولت کو لوٹا ہے اور ان سے یہ لوٹی ہوئی دولت واپس لے کر اس کے اصل حق داروں یعنی اس ملک کے عوام کی خدمت کے لیے استعمال کی جائے۔

عبوری حکومت کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ وہ نہ احتساب کے لیے موثر مشینری قائم نہیں کر سکی اور جو بری بھلی مشینری بنی اس کی طرف سے بھی کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ نیز اب قوم کو ایک دوسرے مغالطے میں مبتلا کرنے کی کوشش بڑی چابک دستی سے کی جا رہی ہے کہ انتخاب ہی دراصل احتساب کا ذریعہ ہیں اور گویا عوام نے ۳ فروری کو وہ احتساب کر لیا۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ انتخاب بھی عوامی احتساب کا ایک حصہ ہیں بشرطیکہ دستور کی تمام دفعات پر عمل ہو اور انتخابی قوانین اور انتخابی عمل اپنے صحیح اصولوں کے مطابق انجام پائے لیکن ان دونوں کی عدم موجودگی میں جس حد تک انتخابات احتساب کا ذریعہ بن سکتے ہیں وہ بھی نہیں بن سکتے چہ جائیکہ ان کو وسیع تر احتسابی عمل کا متبادل سمجھ لیا جائے۔ عوام نے ۳

فروری کے انتخابات میں پی پی پی کی حکومت کو عبرتناک انداز میں رد کر کے اس سے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کر دیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ احتساب پورا ہو گیا' اور اب سارے لوٹنے والے معتبر بن گئے ہیں۔ یہ انتخابات تو صرف احتساب کا پیش خیمہ میں' اصل احتساب تو ابھی ہونا باقی ہے اور یہ ان کا بھی ہونا چاہیے جو پچھلے تین سال برسر اقتدار تھے اور ان کا بھی ہونا چاہیے جو اس سے پہلے ملک کے سیاہ و سپید کے مالک تھے اور اس کے وسائل کو بڑی بے دردی اور دلیری سے لوٹ رہے تھے۔ اس میں وقت کی کسی قید کا کوئی سوال نہیں۔ جو شخص بھی کسی پبلک آفس پر رہا ہے خواہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے یا منتخب نمایندے کی حیثیت سے' اس کا مکمل اور بے لاگ احتساب ہونا چاہیے۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے اور یہی جمہوریت کا اصل الاصول۔ اگر محض انتخاب ہی احتساب ہے تو پھر صدر نکسن اور ان کے نائب صدر اگنیو کا تو بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ عظیم اکثریت سے دوسری بار بلاواسطہ انتخاب میں صدر اور نائب صدر منتخب ہوئے تھے لیکن انھیں احتساب کا مقابلہ کرنا پڑا اور اپنے عہدے چھوڑنے پڑے۔ جاپان اور اٹلی میں منتخب وزرائے اعظم کا احتساب ہوا اور ان کو نہ صرف اپنے عہدے سے معزول کیا گیا بلکہ سزا بھی بھگتنا پڑی۔ اس وقت بھی امریکہ میں کانگرس کے اسپیکر نیوٹ گنگریک کو جس احتساب سے سابقہ درپیش ہوا اس کے بارے میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ ابھی دو ماہ قبل ہی دوبارہ منتخب ہو کر آئے ہیں اس لیے احتساب تو ہو گیا؟ خود ہندستان میں منتخب وزیراعظم اور ۴۰ سے زیادہ منتخب وزرا احتساب کی گرفت میں ہیں اور ان میں کئی جیل میں ہیں یا ضمانت پر۔ اس لیے قانونی' سیاسی اور اخلاقی ہر اعتبار سے احتساب کا عمل ایک مستقل بالذات عمل ہے اور اسے انتخاب سے کنفیوژ کرنے کی کسی کوشش کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس وقت قوم کے ایجنڈے پر پہلا اور سب سے اہم مسئلہ احتساب ہی کا ہے جسے پوری دیانت داری' پورے انصاف اور قطعی بے لاگ انداز میں انجام پانا چاہیے۔ اس کے لیے سرکاری سطح پر تین امور کا اہتمام ضروری ہے۔

پہلی چیز اس کام کو ترجیح اول کے طور پر تسلیم کرنا اور تمام سیاسی پارٹیوں اور تمام شعبہ ہاے حکومت سے تعلق رکھنے والے افراد پر اسے لاگو کرنا ہے۔ اس سلسلے میں نئے وزیراعظم اور خود صدر مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب سے پہلے خود اپنے کو احتساب کے لیے پیش کریں۔ اسی طرح پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام ارکان کا احتساب ہونا چاہیے نیز ماضی کی تمام حکومتوں کے ذمہ دار افراد کا بے لاگ احتساب ہو۔ نہ اس میں کسی سے رو رعایت برتنی چاہیے اور نہ اسے سیاسی انتقام کا ذریعہ بنانے کی اجازت ملنی چاہیے۔ عبوری حکومت نے اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا جس نے اس کی ساکھ اور جواز دونوں کو بری طرح متاثر کیا۔ اب یہی مرحلہ نئی حکومت کو درپیش ہے۔ اس سلسلے میں قوم کسی کوتاہی کو برداشت نہیں کرے گی۔

دوسری فوری ضرورت احتساب کے قانون اور نظام میں ضروری تبدیلیاں ہیں جن کے نتیجے میں احتسابی

نظام حقیقی طور پر غیر جانب دار اور بااختیار بن سکے۔ نیز احتسابی نظام کے لیے جو طریق کار اختیار کیا جائے اسے جہاں انصاف کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے وہاں اسے ان تمام خامیوں سے پاک ہونا چاہیے جن کی وجہ سے ہمارا نظام قانون ظالموں کے باب میں بے بس بن کر رہ گیا ہے اور قانونی موشگافیوں اور دولت کی کرشمہ سامانیوں کا دور دورہ ہے۔ ہمیں محض برطانیہ اور امریکہ کے adversorial طریقے کا اسیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسلامی روایات کی روشنی میں inquisitioinal طریقے کو بھی استعمال کرنا چاہیے (یورپ میں فرانس اور اٹلی میں بھی یہ طریقہ رائج ہے) تاکہ احتسابی ادارہ محض قانون کے الفاظ کے آگے مفلوج نہ ہو جائے بلکہ حقیقت کی تلاش اور انصاف کا قیام اس کا اصل ہدف ہو۔ نیز تمام صوابدیدی اختیارات (discretionery powers) کو ختم کرنے کی ضرورت ہے جو کرپشن کا بہت بڑا سبب ہیں۔ اس کے ساتھ کھلی حکمرانی (open governance) کی روایت قائم کرنے کی ضرورت ہے جو کرپشن کے سدباب کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی نظائر بڑے واضح ہیں۔ اگر صحابہ کرامؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ پہلے ثابت کرو کہ تمھارے جسم پر جو لباس ہے اس میں کسی خیانت کا دخل نہیں ہے اور حضرت عمرؓ جیسے سخت مزاج اور بااقتدار امیرالمومنین نے سب کچھ چھوڑ کر اپنے بیٹے کی شہادت سے ثابت کیا کہ لباس ان دو چادروں سے بنایا گیا ہے جن میں سے ایک ان کی اور ایک ان کے صاحبزادے کی تھی تو آج آخر سیاسی قائدین اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں سے یہ کیوں نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم ثابت کرو کہ تمھارا معیار زندگی، تمھاری جائیدادیں اور تمھارے شاہی اخراجات کہاں تک تمھاری جائز آمدنی پر مبنی ہیں؟ اسمبلیوں کے ارکان نے جو گوشوارے اپنی دولت کے بارے میں داخل کیے ہیں، سب سے پہلے انھی کا احتساب ہونا چاہیے کہ وہ کہاں تک حقائق پر مبنی ہیں اور کہاں دولت کو چھپایا گیا ہے اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح انتخابی اخراجات کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ احتسابی ادارہ اگر چوٹی کے چند سو افراد کی دولت کا جائزہ لے اور ان سے جواب طلبی کرے تو آپ دیکھیں گے کہ ہر سطح پر حالات بدلنے شروع ہو جائیں گے۔ اگر یہ کام انجام نہیں دیا جاتا اور لوٹی ہوئی قومی دولت واپس نہیں لائی جاتی اور آیندہ کے لیے لوٹ کھسوٹ کا دروازہ بند نہیں ہوتا تو قوم محض نمایشی ملمع سازی سے ہرگز دھوکہ نہیں کھائے گی--- ان شاء اللہ! اس کے لیے احتسابی قانون، احتسابی مشینری اور اس کے طریق کار کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ عوام احتسابی نظام پر اعتماد کر سکیں اور قرار واقعی نتائج برآمد ہوں۔

ان دونوں امور کے ساتھ ہماری نگاہ میں ایک چیز اور بھی ضروری ہے اور وہ عوامی سطح پر احتسابی عمل کے لیے رائے عامہ کو برابر متحرک رکھنا اور ان تمام لوگوں کو جو کسی طرح بھی بدعنوانیوں اور ظالمانہ کارروائیوں سے متاثر ہوئے ہیں، بلاخوف انصاف قائم کرنے والے اداروں اور احتسابی نظام سے داد رسی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور قانون کو انھیں مکمل تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔ اس کے لیے جہاں دستور میں

مرقوم حقوق کے حصول کو آسان بنانے کی ضرورت ہے وہیں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ سیاسی جماعتیں' سماجی ادارے' بار ایسوسی ایشنیں اور باضمیر عوامی کارکن مظلوموں کے حقوق کی حفاظت اور قومی دولت کے لوٹنے والوں کے محاسبے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ اس کے لیے عوامی کمیٹیاں بنائی جائیں' وکلا اور سماجی کارکنوں کی تنظیمیں متحرک ہوں۔ کاروباری افراد' جن کو لوٹا گیا ہے' آگے بڑھ کر لوٹنے والوں کا پردہ چاک کریں اور اس طرح اجتماعی زندگی میں احتساب کے عمل کو ایک حقیقت بنا دیں۔

حکومت' پارلیمنٹ' عدالتیں' سیاسی جماعتیں اور سماجی کارکن سب ہی کو اس سلسلے میں اپنا اپنا کردار ادا کرنے پر کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ یہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ جہاں ہر ایک کو اس عمل کا آغاز خود احتسابی سے کرنا چاہیے وہیں اس کے ساتھ اجتماعی احتساب کے نظام کو موثر انداز میں آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ احتساب مالی اور سیاسی بدعنوانی اور کرپشن کے ذمہ دار افراد کا بھی ہونا چاہیے اور حکومتوں کی پالیسیوں اور پاکستان کی قسمت اور اس کے حقیقی مفادات سے کھیلنے والوں کا بھی۔ یہ احتساب عوامی سطح پر ہونا چاہیے' پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے فورم پر ہونا چاہیے۔ اور قانون اور انصاف قائم کرنے والی عدالتوں اور احتسابی کورٹس کے ذریعے ہونا چاہیے۔ اس کے لیے کھلی حکومت' آزاد صحافت اور عوامی مباحثہ بھی ضروری ہیں۔

وقت کا دوسرا تقاضا انداز حکمرانی کی تبدیلی ہے۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان اپنی زندگی کے پہلے پچاس سال میں اس تصور اور اس مقصد سے بہت دور چلا گیا ہے جس کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے اس ملک کے قیام کے لیے جدوجہد کی تھی اور بیش بہا قربانیاں پیش کی تھیں۔ آج عالم یہ ہے کہ پوری قوم ایک ایسے استحصالی نظام کی گرفت میں ہے جس میں چند ہزار طاقتور اور زور آور افراد ملک کے وسائل پر قابض ہیں اور دستور' قانون اور انتخابی سیاست کے علی الرغم انھوں نے ملک کے عوام کو اپنا مزارع اور اس کے وسائل کو اپنی ذاتی جاگیر بنا ڈالا ہے۔ اس استحصالی نظام کا دوسرا خطرناک پہلو یہ ہے کہ اب اس استحصالی طبقہ اور مغربی اقوام اور اداروں کے گٹھ جوڑ نے پاکستان اور اہل پاکستان کی سیاسی' معاشی اور تہذیبی آزادی کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ ملک کا بجٹ اور معاشی پالیسیاں ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی ہدایات کے مطابق اور اب تو اس کے اپنے فرستادہ ماہرین کے ہاتھوں بن رہی ہیں۔ سیاسی امور میں بھی فیصلہ کن حیثیت واشنگٹن کو حاصل ہو گئی ہے! مسئلہ خواہ کشمیر کا ہو یا افغانستان کا' ایران سے تعلقات ہوں یا ہندستان سے' نیوکلیر پالیسی ہو یا فوجی مشقوں کا معاملہ --- سب کے سلسلے میں واشنگٹن کے اشارہ چشم و ابرو کو دیکھا جاتا ہے اور ارباب اقتدار لرزہ براندام رہتے ہیں کہ کہیں انھیں بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کا سرپرست نہ قرار دے دیا جائے!

نظریاتی اعتبار سے بھی صورت حال بڑی تشویش ناک ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسلامی نظام کے قیام کی

طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی اور ملک میں فرقہ وارانہ اور علاقائی عصبیتوں کو ہوا دی جا رہی ہے بلکہ اب تو برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ ہی کو مسخ کر کے یہ تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل مقصد ایک نظریاتی ریاست کا قیام نہیں ہے بلکہ بس معاشی ترقی تھا' اس لیے یہی وقت کی سب سے بڑی ترجیح ہے۔ اسلام معاشی' سماجی اور سائنسی ترقی کو اس کا صحیح مقام دیتا ہے لیکن یہ مقام اس کے نظریاتی اور اخلاقی فریم ورک کے ایک حصہ کے طور پر ہے۔ مسلمان کی اصل شناخت اخلاقی بلندی' انسان دوستی اور قیام انصاف سے ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے ضامن ہیں۔

نظریۂ پاکستان کا تحفظ اور اس کی روشنی میں پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل جدید' سیاسی' معاشی اور معاشرتی آزادی کی حفاظت اور اس کا فروغ اور استحصالی طبقات کی گرفت سے قوم کو نجات دلانا اور ایک ایسا منصفانہ اور صاف شفاف نظام قائم کرنا جس میں اقتدار فی الحقیقت عوام کی طرف منتقل ہو' فیصلے ان کی مرضی اور تمناؤں کے مطابق ہوں اور تمام شہریوں کو بلاامتیاز جان' مال' عزت و آبرو کا تحفظ حاصل ہو' زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل ہوں اور تعمیر و ترقی کی دوڑ میں سب کو جدوجہد کے مساوی مواقع حاصل ہوں تاکہ انسانوں پر انسانوں کی خدائی کا نظام ختم ہو اور سب صرف اللہ کے بندے بن کر خدا کی زمین پر اپنے لیے عزت کا مقام حاصل کر سکیں۔

نظام کی تبدیلی اس وقت واقع ہو گی جب ملک اور اس کے عوام مندرجہ بالا ہدف کی طرف قابل ذکر پیش قدمی کریں گے۔ آج قوم اس فیصلہ کن موڑ پر کھڑی ہے جہاں اگر ملک کا سیاسی عمل اس منزل کی طرف پیش قدمی کا ذریعہ نہیں بنتا تو پھر نظام حکمرانی سے مایوسی' جیسا کہ تاریخ شاہد ہے' مجبور انسانوں کو ان انقلابی راستوں کی طرف لے جاتی ہے جو پھر ہر مزاحم قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں۔

کیا موجودہ قیادت قوم کی اس خواہش اور وقت کے اس تقاضے کا شعور رکھتی ہے اور اس ہدف کے حصول کے لیئے خلوص اور محنت سے سرگرم عمل ہونے کو تیار ہے؟ اب معاملہ محض وعدوں اور خوش کن اعلانات کا نہیں--- وقت کی ضرورت عملی اقدام ہیں اور وہ بھی بلاتاخیر۔ احتساب اور انداز حکمرانی کی تبدیلی--- یہ ہے وہ کسوٹی جس پر نئی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں اور مرکزی اور صوبائی قیادت کی کارکردگی کو جانچا جائے گا اور قوم دیکھے گی کہ:

--- ذمہ دارانہ مناصب کے لیے کس اخلاق' کس صلاحیت اور کس کردار کے لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے؟

--- انتظامیہ اور عدلیہ کے دائروں کو کس رفتار سے دستوری تقاضے کے مطابق الگ کیا جاتا ہے اور عدلیہ کو کتنا مضبوط' کتنا آزاد اور اس کی عددی قوت کو کتنا بڑھایا جاتا ہے کہ لوگوں کو فوری انصاف حاصل ہو سکے؟

--- انتظامیہ میں تقرری' تبادلوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کے سلسلے میں صلاحیت اور ملک کی

معروضی ضروریات کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے یا ماضی کی طرح منظور نظر اور سفارشی لوگوں کو نوازا جاتا ہے؟ نیز انتظامیہ اور پولیس کو کہاں تک سیاسی مقاصد اور سیاسی پارٹی کے اثرات سے محفوظ رکھ کر خالص انتظامی اور پیشہ ورانہ انداز میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے؟

--- قانون سازی اور پالیسی سازی میں پارلیمنٹ اور پارلیمانی اداروں کو کیا مقام دیا جاتا ہے۔ کتنے وقت یہ ادارے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہیں اور کہاں تک ملک کے جمہوری نظام کو آرڈیننس' انتظامی احکام اور ذیلی قانون سازی کی لعنت سے پاک کیا جاتا ہے جن کے ذریعے ماضی میں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا وجود اور عدم وجود مساوی ہو کر رہ گئے تھے؟

--- یہ بھی دیکھا جائے گا کہ قرآن و سنت کو ملک کا بالاتر قانون بنانے کا جو وعدہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں ۱۹۹۱ کے رمضان المبارک میں خود میاں نواز شریف صاحب نے کیا تھا اور بعد میں مختلف عذرات کا سہارا لے کر اسے پس پشت ڈال دیا گیا تھا' اب پارلیمنٹ میں دو تہائی سے زیادہ اکثریت حاصل ہونے کے بعد وہ اسے کہاں تک پورا کرتے ہیں؟ اسی طرح قرآن پاک کی تعلیم کو ابتدائی اور ثانوی سطح پر لازم کرنے اور سود کی لعنت سے معیشت کو پاک کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کو کہاں تک ختم کرتے ہیں؟

--- دوسری دستوری ترامیم کا مسئلہ بھی اہم ہے جن کے ذریعے اختیارات میں توازن پیدا ہو' بنیادی حقوق کے تحفظ کو مزید موثر بنایا جا سکے' عدلیہ کی آزادی اور خصوصیت سے فیڈرل شریعت کورٹ کے ججوں کو مستقل حیثیت اور مکمل عدالتی تحفظ فراہم کیا جا سکے' متناسب نمائندگی کا نظام رائج ہو سکے اور ارکان پارلیمنٹ کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو اور عورتوں کی نمائندگی کا کوئی معقول انتظام ہو سکے جس کے ذریعے ملک کی خواتین کی حقیقی نمائندہ خواتین مجلس قانون ساز میں آ سکیں نہ کہ بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے مردوں کی نمائندہ خواتین!

--- صوبائی خود اختیاری کے دستوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اختیارات اور وسائل کی صوبوں اور لوکل باڈیز کی طرف منتقلی' مردم شماری کا مسئلہ اور قومی زبان کو عملاً ہر سطح پر سرکاری زبان کے طور پر جاری کرنا بھی دستور کے ان واضح مطالبات میں سے ہے جن کو ماضی کی ہر حکومت نے نظرانداز کیا ہے۔ اسی طرح ان دستوری اداروں کو متحرک کرنا اور موثر بنانا ضروری ہے جو معطل پڑے ہوئے ہیں یعنی اسلامی نظریاتی کونسل' فیڈرل شریعت کورٹ' سپریم کورٹ کا شریعت اپیلیٹ بنچ' کونسل آف کومن انٹرسٹس اور نیشنل اکنومک کونسل۔ نیز شریعت ایکٹ کے تحت قائم ہونے والے معاشی کمیشن اور تعلیمی کمیشن اور دستور کے رہنما اصولوں کے مطابق قانون سازی اور پالیسی سازی کا بروقت جائزہ لینے اور اس پر اسلامی نظریاتی کونسل' مرکزی زکوٰۃ کونسل اور ایسے ہی دوسرے اداروں کی رپورٹوں پر پارلیمنٹ میں بحث اور اس کی روشنی میں نئی قانون سازی اور پالیسی

سازی۔

--- معاشی ترقی کا حصول، دولت کی منصفانہ تقسیم، غربت، بے روزگاری اور مہنگائی کا خاتمہ اور بیرونی قرضوں سے نجات اور حقیقی خود انحصاری کا حصول بھی وہ چیلنج ہیں جن کے بارے میں فوری اقدام ضروری ہوں گے۔ انتخابی مہم کے دوران "کشکول گدائی توڑنے" کا بڑا چرچا تھا لیکن اب اس وعدے پر عمل کا وقت ہے اور نئی قیادت کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ کہاں تک اس منزل کی طرف پیش قدمی کرتی ہے جہاں تک ۹۳-۱۹۹۰ کے تجربے کا تعلق ہے تو وہ اس دعویٰ کے اعتبار سے بڑا مایوس کن تھا جس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

ملکی اور بیرونی قرضے

سال	ملکی قرضے	بیرونی قرضے	کل قرض	کل سالانہ ادائیگی سود و قرض
۹۰-۱۹۸۹	۳۷۸.۳ ارب	۳۲۸.۹ ارب	۷۰۷.۲ ارب	۶۶.۱ ارب
۹۳-۱۹۹۲	۶۰۲.۴ ارب	۵۱۷.۲ ارب	۱۱۱۹.۶ ارب	۱۰۷.۹ ارب
۹۶-۱۹۹۵	۹۰۸.۹ ارب	۶۸۵.۸ ارب	۱۷۱۸.۶ ارب	۱۹۳.۱ ارب

(بحوالہ اسٹیٹ بنک سالانہ رپورٹ ۱۹۹۶، صفحہ ۹۱)

اس پس منظر میں نئی حکومت کو بڑا سخت امتحان درپیش ہے اور معاشی نظام میں اور معاشی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر وہ حقیقی خود انحصاری کے حصول اور ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی ڈکٹیٹر شپ سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اسے جلد از جلد خود سود کے بارے میں ایک جرات مندانہ فیصلہ کرنا ہو گا۔ یہ ہمارے ایمان اور دستور کا تقاضا بھی ہے اور صحیح معاشی حکمت عملی کا بھی۔

لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، جس پر عام افراد کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کا انحصار ہے اور ملک کی معاشی ترقی اور سیاسی ساکھ بھی اس پر منحصر ہے۔

کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور جس مجرمانہ طور پر اس سے پچھلی حکومتوں نے اغماض برتا ہے اس کا تحریک جہاد کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اب تحریک جہاد کی تائید اور پوری یکسوئی کے ساتھ کشمیر کے مسئلے کے باعزت اور یو این او کی قراردادوں کی روشنی میں مستقل حل کے لیے فیصلہ کن جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس کے لیے پوری قوم کو تیار کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ ہندستان سے سیاسی اور تجارتی تعلقات دونوں کا انحصار کشمیر کے مسئلے کے منصفانہ اور عالمی عہد و پیمان کے مطابق حل پر ہے۔ اس طرف پیش رفت کے بغیر تعلقات کو معمول پر لانے کی باتیں قومی عزائم اور مجاہدین کی قربانیوں سے ناقابل معافی بے وفائی کے مترادف ہوں گی۔

چین، افغانستان، ایران اور وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں سے سیاسی تعلقات میں استحکام اور معاشی روابط میں وسعت اور گہرائی بھی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ پی پی پی کی حکومت کی خارجہ پالیسی

پاکستان کی ناکام ترین پالیسی تھی جس نے ملک کو اپنے دوستوں سے کاٹ دیا اور غیروں پر انحصار اور محتاجگی میں اضافہ کر دیا۔ آج پاکستان کو ایک واضح اور پر عزم' موثر اور متحرک خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے۔

--- تعلیم کا فروغ اور صحت عامہ کی سہولتوں کی فراہمی بھی وہ اہم ترین میدان ہیں جن کے لیے ضرورت کے مطابق سرکاری اور نجی وسائل کی فراہمی کی ضرورت ہے تاکہ معاشرے کے مجبوروں کو سہارا دیا جا سکے اور کم از کم نئی نسل کو اپنے دین و ایمان کے مطابق پاکستانی معاشرے کی ہمہ ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنایا جا سکے۔

تبدیلی کا یہ وہ ایجنڈا ہے جس پر عمل وقت کی ضرورت ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر نئی حکومت' نئی پارلیمنٹ اور نئی اسمبلیوں کی کارکردگی کو جانچا اور پرکھا جائے گا اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ اس سلسلے میں پہلے چند مہینے بڑے اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ اگر حکومت صحیح راستے کو اختیار کرتی ہے تو ہر جماعتی اور گروہی تعصب سے بالا ہو کر سب کو اس کام میں تعاون کرنا چاہیے۔ تحریک اسلامی کی یہی مستقل پالیسی ہے جو اس کے ہر منشور میں بیان کی جاتی رہی ہے یعنی نیکی' بھلائی' صلاح اور فلاح کے ہر اقدام کی تائید' خواہ اس کا سہرا کسی کے سر ہو' مقصد سے ہماری وفاداری کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر حکومت اپنا قبلہ درست نہیں کرتی اور پاکستان کے مقصد وجود اور قوم کے واضح مطالبات کو نظرانداز کر کے محض چند نمایشی حربے استعمال کر کے ماضی کی ڈگر پر چلتی ہے تو عوام اور ساری اسلامی قوتوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ فساد اور بگاڑ کی ہر قوت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اس قوم کی اس کی اصل منزل کی طرف پیش قدمی کے لیے فیصلہ کن جدوجہد کریں۔

آخر میں ہم تحریک اسلامی اور اس کے کارکنوں کو بھی چند امور کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ تحریک اسلامی کا اصل ہدف اللہ کی رضا کا حصول اور اللہ کی زمین پر اللہ ہی کے دین کے قیام کی جدوجہد ہے۔ ہماری بنیادی حیثیت داعی اور طالب خیر کی ہے اور اللہ کے تمام بندوں سے ہمارا رشتہ دعوت الی الخیر کی خاطر ہمدردی' محبت اور اخوت کا ہے۔ جس طرح اللہ کے برگزیدہ انبیا نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ان کا اجر صرف ان کے رب کے پاس ہے اور وہ انسانوں کی اصلاح' ان کی خدمت اور ان کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کے راستہ سے روشناس کرانے' نیکیوں کو قائم کرنے اور برائیوں کو روکنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں' اسی طرح ہمیں بھی سمجھنا چاہیے اور اس کا اعلان کرنا چاہیے کہ ہم انھی کے نقش قدم پر چلنے اور انھی کی دعوت اور جدوجہد کو آگے بڑھانے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہمارا پیغام بھی دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور ہمارا مسلک بھی "اشداء علی الکفار اور رحماء بینھم" سے عبارت ہے۔ ہماری دوستی اور ہماری مخالفت اسی مقصد اور اسی دعوت کی بنیاد پر ہے۔ تحریک اسلامی قوم کا اجتماعی ضمیر ہے اور اسے اس

اخلاقی اور اجتماعی انقلاب کے لیے تیار کرنے میں مصروف ہے جس کے نتیجے میں زمین پر خدا کی مرضی پوری ہو' اس کے قانون کی حکمرانی قائم ہو' تمام انسان اس کے بندے بن کر ایک دوسرے کے لیے قوت کا ذریعہ بنیں اور یہ امت ظلم و عدوان کے خلاف جہاد میں مصروف ہو تاکہ تمام مظلوم انسانوں کو اللہ کے دین کے سایہ میں امن و انصاف مل سکے۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں اور اس کی قیادت کے لیے خود احتسابی اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے جتنی عام انسانوں اور بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے۔ اس لیے ہمیں ہر لمحہ اپنے مقصد کی تذکیر' اپنے عہد کی تجدید' اپنی کوتاہیوں پر استغفار' اپنے ساتھیوں کے درمیان نصیحت و تلقین اور میدان عمل میں اپنی دعوت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مکمل انہماک کا اہتمام کرنا چاہیے۔ خود احتسابی اور اجتماعی احتساب کو زندہ رکھنا اور موثر تر بنانا وقت کا تقاضا اور ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ اللہ سے تعلق اور اللہ کے بندوں کو اپنے رب اور انسانوں کے حقوق ادا کرنے کی دعوت و تلقین ہمارے کرنے کا اصل کام ہے۔ معاشرے سے ظلم کو مٹانا اور انصاف کو عام کرنا ہمارا ہدف اور ذمہ داری ہے۔ خیر اور شر میں تمیز اور خیر کے حصول کی کوشش اور شر سے بچنے اور انسانوں کو بچانے کی جدوجہد ہی سے اصلاح کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ اس کے لیے صرف انفرادی جدوجہد کافی نہیں۔ اجتماعی جدوجہد اور منظم کوشش کے بغیر یہ بازی سر نہیں کی جا سکتی۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ عوام سے گہرا اور قریبی ربط رکھیں۔ یہ وقت گھروں میں بیٹھنے کا نہیں عوام میں نکلنے اور شہر شہر' گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پہنچنے' عوام کو بیدار کرنے اور صحیح خطوط پر جدوجہد میں شریک کرانے کا ہے۔ اللہ پر بھروسے کے بعد ہمارا سرمایہ کار ہمارے عوام ہیں اور انھیں بیدار اور منظم کرنا بھی ہمارا اصل کام ہے۔ تعلیم' خدمت خلق' دعوت اسلامی' اخلاقی اصلاح' نوجوانوں اور تمام طبقات کی ایسی صف بندی جس کے نتیجے میں عوامی سیاسی بیداری' حقوق و فرائض کی ادائیگی کے لیے اجتماعی جدوجہد اور ایک ایسی نئی قیادت کو قوم میں ابھارنے کی سعی جو اللہ کی وفادار' دین کی مخلص اور امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے جان اور مال کی بازی لگانے والی ہو' جس کا مقصود دنیا میں اپنے ذاتی مفادات کا حصول نہیں بلکہ ان مقاصد کا حصول ہو جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے امتِ مُسلمہ کو برپا کیا ہے اور جو اس کا نصب العین اور فرض منصبی ہے یعنی:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳:۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور اس مقصد کے حصول کی جدوجہد' حکمت' بالغ نظری' اور انصاف کے ساتھ انجام دیتی ہے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

ادْعُ إِلٰى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل ۱۶:۱۲۵)

اے نبیؐ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔

نیز ہمارا کام برائی کو بھی نیکی سے بدلنا اور اس طریقے سے تبدیل کرنا ہے جو احسن ہو۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۔ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم السجدہ ۴۱: ۳۴)

اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

اس پوری جدوجہد کو ہر قسم کے نفسانی جذبات سے پاک رکھنا بھی ہماری کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ کسی لمحہ بھی انصاف کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا (المائدہ ۵: ۲)

اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصہ تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔

اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ (المائدہ ۵: ۸)

عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (الانعام ۶: ۱۵۲)

اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتے دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء ۴: ۵۸)

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

ذکرِ الٰہی، دعوت الی الخیر، جہاد بالمال والنفس، موعظۃ الحسنہ، حکمت اور عدل و احسان ہمارے اصل ہتھیار اور ہماری کامیابی کے ضامن ہیں۔ یہ تحریک انسانوں کی زندگی کو فساد سے پاک کرنے اور خیر و صلاح سے بھر دینے کے لیے اٹھی ہے، یہ منفی نہیں اور ایک مثبت پیغام کی داعی اور اصلاحی انقلاب کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ زمانے کا رخ بدلنے اور تاریخ کے دھارے کو موڑنے کے لیے سرگرم عمل ہے اور یہی زندگی اور ترقی کا اصل راستہ ہے۔

حدیثِ بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز!
زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!

اس کے ری پرنٹس دستیاب ہیں۔ ۱۵۰ روپے سیکڑہ، منشورات، منصورہ، لاہور ۵۴۵۷۰

حکمتِ عملی کے تقاضے

ہم جس ملک اور جس آبادی میں بھی ایک قائم شدہ نظام کو تبدیل کر کے دوسرا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے وہاں ایسا خلا ہم کو کبھی نہ ملے گا کہ ہم بس اطمینان سے "براہِ راست" اپنے مقصود کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ لامحالہ اس ملک کی کوئی تاریخ ہو گی۔ اس آبادی کی مجموعی طور پر اور اس کے مختلف عناصر کی انفرادی طور پر کچھ روایات ہوں گی۔ کوئی ذہنی اور اخلاقی اور نفسیاتی فضا بھی وہاں موجود ہو گی۔ ہماری طرح کچھ دوسرے دماغ اور دست و پا بھی وہاں پائے جاتے ہوں گے جو کسی اور طرح سوچنے والے اور کسی اور راستے کی طرف اس ملک اور اس آبادی کو لے چلنے کی سعی کرنے والے ہوں گے۔

ان مختلف عوامل میں سے کچھ ہمارے موافق ہوں گے تو کچھ ناموافق اور مزاحم بھی ہوں گے اور قائم شدہ نظام کا کسی کم یا زیادہ مدت سے وہاں قائم ہونا خود اس بات کی دلیل ہو گا کہ یہ عوامل ہماری موافقت میں کم اور اس کی موافقت میں زیادہ ہیں۔ علاوہ بریں یہ بات بالکل فطری اور عین متوقع ہے کہ ہمارے مقابلے میں یہ نظام ضرور ان تمام عوامل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لیے سازگار ہیں یا بن سکتے ہیں اور ایسے تمام عوامل کو ہمارے لیے ناموافق یا کم از کم غیر مفید بنانے کی بھی سعی کرے گا جنہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے حق میں سازگار ہیں۔ اور وہ تمام دوسری تحریکیں بھی جو ہمارے مقصد کی مخالف ہیں یا تو قائم شدہ نظام کی حمایت کریں گی' یا پھر موجود الوقت عوامل کو حتی للامکان ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔

ان حالات میں نہ تو اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہم کہیں اور سے پوری تیاری کر کے آئیں اور یکایک اس نظام کو بدل ڈالیں جو ملک کے ماضی اور حال میں اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اسی ماحول میں رہ کر کشمکش کے بغیر کہیں الگ بیٹھے ہوئے اتنی تیاری کر لیں کہ میدان مقابلہ میں اترتے ہی سیدھے منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔ اور نہ اس بات ہی کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس کشمکش میں سے گزرتے ہوئے کسی طرح "براہ راست" اپنے مقصود تک جا پہنچیں۔ ہمیں لامحالہ واقعات کی اس دنیا میں موافق عوامل سے مدد لیتے ہوئے اور مزاحم طاقتوں سے کشمکش کرتے ہوئے بتدریج اپنا راستہ نکالنا ہو گا۔ ہر قدم جس کے لیے

گنجایش نکل آئے فوراً اور بروقت اٹھا دینا ہو گا۔ دوسرے قدم کی گنجایش پیدا کرنے کے لیے پورا زور لگانا پڑے گا' اور سمت مخالف کی دھکا پیل اگر ہمیں پیچھے دھکیلے تو اس بات کی کوشش کرنی ہو گی کہ پہلے قدم کی جگہ پاؤں تلے سے نہ نکل جائے۔

اس کشمکش کے دوران میں جتنی ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا آخری اور اصلی مقصود ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو' اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم اس کی سمت میں بڑھنے کے لیے ہر درمیانی قدم کو مقصدی اہمیت دیں' جو قدم رکھا جا چکا ہے' اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں' آگے کے قدم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کریں' اور جونہی اس کے لیے جگہ پیدا ہو' اس پر فوراً قبضہ کر لیں۔ آخری مقصود پر نگاہ جمانا اگر اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی قدم غلط سمت میں نہ اٹھے' تو درمیان کے ہر قدم کو اس کے وقت پر قریبی مطمح نظر کی حیثیت دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیش قدمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا نہ کرنا ہو بلکہ منزل مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو' اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو کم کرنے کے لیے اس طرح لڑنا ہو گا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملے میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظرانداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ یا تو قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا' یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا۔ اسے تو عملی نقطہ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے' جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں' ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابل قبول ہے اور کون سی نہیں' اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔

نظری آدمی تو بے تکلف کسی مرحلے پر بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانے اور قدم قدم کی جگہ کے لیے کشمکش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ "براہ راست" کیوں نہیں بڑھ جاتے۔ مگر کام کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ راستے کی مزاحم طاقتوں کے ہجوم میں سے آخر براہ راست کیسے بڑھ جاؤں؟ ان کے سر پر سے چھلانگ لگا کر جاؤں؟ زمین کے نیچے سے سرنگ لگا کر جا پہنچوں؟ یا کوئی تعویذ ایسا لاؤں کہ اسے دیکھتے ہی یہ سارا ہجوم چھٹ جائے اور میں اپنے قافلے کو لیے ہوئے سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاؤں؟

نظری آدمی اس کشمکش کے دوران میں کسی جگہ بھی ٹھہر جانے یا پیچھے ہٹ جانے کا بڑے اطمینان سے مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر کر یا پیچھے ہٹ کر تیاری کرو اور پھر اس شان سے آؤ کہ بس

ایک ہی ہلے میں سابق نظام ختم اور نیا نظام پورا کا پورا قائم ہو جائے۔ مگر کام کرنے والے کو ایسے مشورے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مزاحم طاقتوں کی موجودگی میں کشمکش روک کر ٹھہر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ پیچھے ہٹوں تو بیک بلہ منزل پر پہنچنا تو درکنار اس جگہ واپس آنے کا بھی کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے جہاں سے پلٹنے کے لیے کہا جا رہا ہے؟ اور کیا میرے ٹھہرنے یا ہٹنے کی صورت میں مزاحم طاقتیں بھی ٹھہر یا ہٹ جائیں گی کہ وہ ماحول کو میرے لیے اور زیادہ سازگار بنانے سے رک جائیں اور میں اسے خوب سازگار بنا کر اور خود پوری طرح تیار ہو کر بڑے اطمینان سے ایک بھرپور حملہ کر سکوں؟

غرض نظری آدمی کے لیے ہر قابل تصور تجویز لے آنا ممکن ہے کیونکہ جن تخیلات کے عالم میں وہ رہتا ہے وہاں حالات اور واقعات موجود نہیں ہوتے صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں' مگر کام کرنے والا واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے اور اس پر کام چلانے کی ذمہ داری ہوتی ہے' اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔

ایک اور حیثیت سے بھی نظریت اور حکمت عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنا اس شخص کے لیے ضروری ہے جو واقعات کی دنیا میں عملاً اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتا ہو۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے' اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف ان ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں' دوسری طرف ان مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں۔ اور تیسری طرف موافق اور ناموافق حالات کے اس گھٹتے بڑھتے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل سازگار مل سکتی ہیں۔ کم از کم اہل حق کو تو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔

اس صورت حال میں جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا' اور پھر دوران سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثنا اور کسی لچک کی گنجایش بھی نہ رکھوں گا' وہ عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمت عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے' کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے' کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجایش نکالنا چاہیے۔

مہلت رکھی ہو، اور یہ بیماری اس فرصت کے لیے بہانہ بن جائے، جو بہت سے کاموں کی تکمیل کے لیے درکار ہے۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، اب بھی خبر گیری کرنے والا وہی ہے، اور وہ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ ہے۔ وہی کافی ہو گا وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔

تم سب کے بارے میں میری جو آرزوئیں اور تمنائیں رہی ہیں، وہ عموماً دعا کے قالب میں ڈھل کر بیان ہوتی رہی ہیں۔ تعلیم و تربیت کا کام تو میں بہت کم ہی کر سکا ہوں۔ اس لحاظ سے اپنی کوتاہیوں کا شدید احساس ہے اور امید ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ان کوتاہیوں کے لیے قیامت کے دن میرا دامن گیر نہ ہو گا۔ ساتھ ہی اللہ کے اس عظیم الشان احسان کا شکر میرے بس سے باہر ہے کہ اس نے تم سب کو میری آرزوؤں اور میرے اعمال سے کہیں بڑھ کر نیک اور صالح بنایا، اور اپنے دین کے لیے کام کرنے والا بنایا ہے۔ لوگ اس کا کریڈٹ مجھے دیتے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس میں کسی کی کوشش کو دخل ہے تو تمھاری اپنی کوششوں کو، اور تم بچوں کی حد تک تمھاری امی کو۔ لیکن یہ دین تو خالص اللہ کی ہے، تم پر بھی اس کی نعمت اور میرے اوپر بھی۔

یہ آرزوئیں اور تمنائیں، کچھ کھلی اور کچھ چھپی ہمیشہ ہی رہی ہوں گی اور رہی ہیں، لیکن جب میں ۱۹۷۱ میں ڈھاکہ میں تم سب سے اس طرح جدا ہوا کہ دوبارہ ملنے کی امید کم ہی تھی، جس طرح موت جدا کرتی ہے۔ ۱۶ دسمبر ۷۱ کو اس حال میں گھر سے نکلا کہ ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ کیفیت یہ تھی کہ جانور کے پاس بھی اپنا مسکن ہوتا ہے، چند دن تو مجھے نظر نہ آتا تھا کہ کہاں پناہ لوں گا۔ کسی مخلوق سے درخواست پناہ بھی نہ کرنا چاہتا تھا، نہ بحمدللہ کی۔ پھر اللہ نے پناہ بھی دی، عزت کے ساتھ دی، حفاظت بھی فرمائی اور [بھارت میں جنگی قیدیوں کے] کیمپ میں میری موجودگی پر پردہ ڈالے رکھا۔ وہاں بھی ایک دن سروں پر سے گولیاں گزرتی رہیں، ہم اوندھے زمین پر لیٹے رہے، اور اس نے محفوظ رکھا، اور پھر بخیر و سلامتی تم سب سے لا ملایا، اور پھر باقی ماندہ زندگی، فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (انفال ۸: ۲۶۔ اپنی مدد سے تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا) کی تصویر بن گئی۔

کیمپ کی زندگی میں، تین سو آدمیوں کے پنجرے میں، انجمن کے باوجود خلوت کا مزا تھا کہ زندگی کی کوئی دوسری مشغولیت اور فکر نہ تھی، اور تم سب کی فکر میں نے اللہ پر چھوڑ دی تھی، جیسے آج چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن، کسی سوزش اور حسرت کے بغیر، سب سے بڑھ کر تعلق اور یاد تم ہی سے تھا۔ اس مدت میں جب اللہ نے تقریباً ہر شب ہی دعائے سحر گاہی کی نعمت بخشی، تو تمھارے بارے میں تمام آرزوئیں دعا کے قالب میں ڈھل گئیں۔ اس کے بعد سے آج تک، جب بھی اور جتنی بھی اس دعا کی توفیق دی گئی، اس میں تمھارا حصہ

اپنی تربیت کے لیے،
تعمیر سیرت کے لیے،

ارادہ موجود ہو تو
تعلیم و تربیت کی معمولی سی پھوار سے بھی
لہلہاتی فصل کھڑی ہو جائے گی

ارادہ موجود نہ ہو تو
تعلیم و تربیت کی بڑی سے بڑی بارش بھی رائیگاں جائے گی!

خرم مراد

(بندہ خدا)

فہمِ حدیث

اللہ کا اپنے بندوں سے پیار

مولانا عبدالمالک

حضرت ابوذر غفاریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور رسول اللہؐ اپنے رب تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ رب العالمین نے فرمایا:

اے میرے بندو! میں نے ظلم اپنے اوپر حرام کیا ہے اور تمھارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا ہے‘ اس لیے تم بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو!

اے میرے بندو! تم سب بے راہ ہو سوائے ان کے جن کو میں نے ہدایت دی۔ پس مجھ سے ہدایت مانگو میں تمھیں ہدایت دوں گا۔

اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے ان کے جن کو میں نے کھانا دیا۔ پس مجھ سے مانگو میں تمھیں کھانا دوں گا۔

اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو سوائے ان کے جن کو میں کپڑے پہناؤں۔ پس مجھ سے کپڑے مانگو میں تمھیں کپڑے دوں گا۔

اے میرے بندو! تم دن رات خطا کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخشتا ہوں۔ پس تم مجھ سے بخشش مانگو میں تمھاری بخشش کروں گا۔

اے میرے بندو! تم مجھے نقصان پہنچانے کی حیثیت تک نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نقصان پہنچا سکو‘ اور مجھے نفع پہنچانے کے مقام تک بھی نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔

اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور تمھارے پچھلے‘ تمھارے انسان اور تمھارے جن اپنے میں سے سب سے زیادہ متقی انسان کے دل کی طرح دل پالیں تو یہ چیز میرے اقتدار میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں کرے گی۔

اے میرے بندو! اگر تمھارے انسان‘ تمھارے جن تمھارے اگلے اور تمھارے پچھلے اپنے میں سے سب سے بڑھ کر بدکار انسان جیسا دل پالیں تو اس سے میرے اقتدار میں کچھ کمی نہیں آئے گی۔

اے میرے بندو! اگر تمھارے اول تمھارے آخر‘ تمھارے انسان تمھارے جن‘ سب ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں‘ پھر میں ہر انسان کی منہ مانگی مراد پوری کر دوں تو یہ (میرے خزانوں) میں کمی نہ کرے گی مگر اتنی جتنی سوئی سمندر کے پانی میں کمی کرتی ہے‘ جب اسے سمندر میں داخل کیا

جائے۔

اے میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں' میں انھیں تمھیں واپس لوٹانے کے لیے محفوظ رکھتا ہوں' تمھیں واپس لوٹا دوں گا۔ پس جو بھلائی پائے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ پائے تو نہ ملامت کرے مگر اپنے نفس کو۔ (مسلم شریف)

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دس مرتبہ "یاعبادی" اے میرے بندو کہہ کر پکارا ہے۔ اس پکار میں بہت پیار ہے۔ جب باپ اپنے بیٹے کو میرے بیٹے کہہ کر پکارتا ہے تو وہ بیٹے کو پیار دیتا ہے اور اس پیار میں ترغیب ہوتی ہے' بیٹا شفقت پدری کے سامنے بچھ جاتا ہے اور آداب فرزندی بجالاتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ لبیک کہتے ہوئے خدمت میں حاضر ہو کر دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے اور والد کے حکم کی تعمیل شروع کر دیتا ہے۔ یاعبادی کی اس پکار میں بھی یہی لطف ہے۔ اس میں مولیٰ اپنے بندوں کو رشتہ عبدیت یاد دلاتے ہوئے پکارتے ہیں کہ تم میرے بندے ہو' میں تمھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور تم میرے بندے ہو کر مجھے چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو۔ میں تم پر اس قدر مہربان ہوں کہ میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ میں معبود اور عظمت و جلال اور قدرت و کمال سے متصف ہوتے ہوئے اگر ظلم نہیں کرتا تو کسی دوسرے کو بھی طاقت میں مغرور ہو کر ظلم کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے ظلم کو تمھارے مابین بھی حرام کر دیا ہے' اس لیے کہ تم میرے بندے ہو' تمھارے درمیان رشتہ عبدیت کا اشتراک ہے اور اس لحاظ سے تمھارے درمیان اخوت و محبت ہونی چاہیے۔ کوئی کسی کا معبود بننے کی کوشش کر کے ظلم کا مرتکب نہ ہو' معبود تو صرف میں ہوں' تم میں سے کوئی بھی معبود نہیں ہے' تم سب بندے ہو اس لیے کوئی بھی کسی پر برتری اور بالادستی قائم کر کے دوسروں کو اپنا بندہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ ظلم کی اصل بنیاد اپنی بندگی سے تجاوز کر کے دوسروں کو اپنا بندہ بناتا ہے۔ اس تجاوز کو طغیان اور تجاوز کرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ جب طاغوت کی حکمرانی قائم ہوتی ہے' شرک و کفر' فسق و فجور اور باطل نظاموں کا چلن ہوتا ہے تو معاشرہ میں عدل و اعتدال اور توازن و مساوات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ پھر لوگوں کے جان و مال' عزت و آبرو محفوظ نہیں رہتے۔ یہ ظلم کی مختلف شکلوں کو جنم دیتا ہے' طبقاتی اونچ نیچ پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ یاعبادی کہہ کر اپنے بندوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور اس حقیقت کو مزید اجاگر فرماتے ہیں کہ معبود' آقا اور حاکم صرف میری ذات ہے۔ میں ہی سب کی ضروریات پوری کرتا ہوں۔ میں نے دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے انسانوں کو علم اور ہدایت کے وسائل و ذرائع عطا فرمائے ہیں' سمع و بصر' حواس اور عقل میں نے دیے ہیں۔ میں یہ وسائل عطا نہ کرتا تو انسان کو کائنات کے خزانوں کو معلوم کرنے' انھیں نکالنے اور ان سے استفادے کے طریقے کون بتلاتا۔ یہ میں ہی ہوں جس نے کائنات کے اسرار و رموز تک رسائی کے اسباب و ذرائع عطا فرمائے اور انبیا علیہم السلام کے ذریعے نظام ہدایت عطا فرمایا۔ تکوینی اور تشریعی دونوں قسم کی ہدایات میرے پاس ہیں' اس لیے مجھی کو ہادی جانو۔

پھر جس طرح ہادی میں ہوں اسی طرح بھوکوں کو کھانا اور ننگوں کو کپڑا بھی میں ہی دیتا ہوں۔ یہ میرے انعامات ہیں۔ میرے علاوہ کون ہے جو تمھیں یہ نعمتیں عطا کرتا ہو؟ اس لیے مجھی سے ہدایت' کھانا اور کپڑا اور دوسری ضروریات مانگو' میں تمھیں دوں گا۔ جب یہ سب میں دے رہا ہوں تو پھر دوسرا کون ہے جو لوگوں کو اپنا بندہ بنا کر ظلم کا ارتکاب کرتا ہے!

پھر بندوں کے ساتھ میرا پیار دیکھو کہ تم بندے ہو کر رات کی تنہائیوں میں اور دن کی روشنیوں میں گناہ کرتے نہیں شرماتے۔ لیکن میں تمام گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں۔ مجھ سے مانگو میں بخشوں گا' کوئی اور نہیں ہے جو تمھیں کچھ عطا کر سکے' میں ہی ہوں اور تمھیں پکار رہا ہوں کہ آؤ میرے خزانوں سے اپنی جھولیاں اور دامن بھر لو۔ جو تمھیں اپنا غلام اور بندہ بنا کر رکھنا چاہتے ہیں وہ تمھیں کچھ دینے کے قابل نہیں۔ تم ان سے مانگتے ہو تو وہ تم سے چھپتے ہیں' اپنے خزانوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں کہ کہیں خرچ کر کے کنگال نہ ہو جائیں' لیکن میں ایسا حاکم اور بادشاہ ہوں کہ تم سب اگلے پچھلے جن و انس ایک میدان میں جمع ہو جاؤ اور ہر ایک جو سوال' جو تمنا جو آرزو اور خواہش کرے میں اسے پورا کر دوں تو میرے خزانوں میں اتنی بھی کمی نہ آئے جس قدر سوئی کی نوک سمندر کے پانی میں کرتی ہے۔

میری بندگی کرنے' ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے' ایک دوسرے کا معبود نہ بننے اور صرف میری بندگی کرنے میں تمھارا ہی فائدہ ہے' میرا ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں ہے۔ دنیا کے حکمرانوں کی حکومتیں عوام کے تعاون اور وفاداری اور حمایت کی محتاج ہوتی ہیں وہ ساتھ دیں تو باقی رہتی ہیں' ساتھ نہ دیں تو ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن میری حکومت عوام کے تعاون سے نہیں اپنے زور پر قائم ہے۔ تم سب انتہائی درجے کے متقی آدمی کی طرح متقی بن جاؤ اور کوئی ایک انسان بھی ایسا نہ ہو کہ ذرہ برابر میری نافرمانی کرے' تب بھی میری حکومت کو ذرہ برابر فائدہ نہیں اور اگر سب' سب سے بدکار انسان کی مانند ہو جاؤ تب بھی میری حکومت کو ذرہ برابر نقصان نہیں' وہ ذرا بھی کمزور نہ ہو گی۔ تم میں سے کوئی نہ مجھے فائدہ پہنچانے کی پوزیشن میں ہے' نہ نقصان پہنچانے کی۔ یہ بات بھی یاد رکھو کہ تمھارے شب و روز' تمھاری خلوت و جلوت' تمھارے ظاہر و باطن' تمھارا سونا اور جاگنا' تمھارا چلنا پھرنا' تمھاری نشست و برخاست' تمھاری تمام سرگرمیاں لکھی جا رہی ہیں اور تمھاری زندگی کی فلم تیار ہو رہی ہے۔ کل قیامت کے روز تمھاری یہی زندگی' یہی اعمال سامنے آ جائیں گے اور اعضا خود بول پڑیں گے۔ میری بندگی کی زندگی تمھیں جنت میں لے جائے گی لیکن اگر تمھارے اعمال تمھیں دوزخ میں لے جائیں تو کسی دوسرے کو نہیں بلکہ' اپنے آپ ہی کو ملامت کرنا۔

اس حدیث قدسی میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار پورے دس مرتبہ جس پیار سے یاعبادی پکار کر اللہ نے ظلم کے خاتمے کا حکم دیا ہے۔ اس پیار کے شایان شان جذبہ اور شوق ہم بندوں کے اندر ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنی جگہ اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم کسی درجہ میں اللہ تعالیٰ یا بندوں کے حقوق' ماں باپ' بیوی بچوں' اعزہ و اقارب' دوست احباب' اڑوس پڑوس' محلے' شہر اور ملک و ملت میں سے کسی پر ظلم کے مرتکب تو نہیں' خود بھی ظلم سے بچیں اور دوسروں کو بھی روکیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عبدیت کی پکار اور تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق اپنے اس عقیدے کو پختہ اور راسخ کریں کہ وہی منعم حقیقی ہے' وہی ہماری تمام ضروریات پوری کر رہا ہے۔ ہم اپنے بل بوتے پر یا کسی دوسرے کے سہارے اپنی کوئی بھی ضرورت پوری نہیں کر سکتے' وہ بن مانگے بھی دیتا ہے لیکن آیئے! اس کے حکم پر ہم یہ چیزیں' یہ ضرورتیں اس سے مانگیں اس کے سوالی بنیں' اس کے سامنے اپنی بندگی اور عاجزی کا اظہار کریں تاکہ اس کے سوالیوں اور بندوں میں جگہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اور کہا تمہارے رب نے مجھ سے مانگو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ جہنم میں ذلیل و خوار ہو کر داخل ہوں گے (المومن ۴۰:۶۰)

اللہ سے اپنی ضروریات روٹی' کپڑا' مکان وغیرہ مانگنے کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان ناجائز ذرائع سے ان چیزوں کے حصول کو چھوڑ دے۔ چوری' غصب' خیانت' ڈاکہ' رشوت' سود' جوا وغیرہ جو بھی باطل طریقے ہیں' ان کو اختیار کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ اللہ سے نہیں مانگتے بلکہ اپنا رزق اپنے بل بوتے پر یا دوسروں کے سہارے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس معاشرے میں اسلام کا معاشی نظام نافذ نہ ہو' جہاں حلال و حرام کی تمیز نہ ہو' یا جو فرد حلال و حرام' جائز و ناجائز کو نظرانداز کیے ہوئے ہے' اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ شخص یا ملک و قوم' اللہ تعالیٰ کو اپنا رازق نہیں سمجھتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس پیار بھرے الفاظ یاعبادی "اے میرے بندو" کے ذریعے سے مانگنے کی ترغیب دی' اس کا جواب رعونت اور تکبر سے اور بے اعتمادی سے دے رہا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں' کارسازوں اور مشکل کشاؤں کو اپنی کسی ضرورت کے لیے اسباب کے درجے میں نہیں بلکہ مافوق الاسباب طریقے سے پکارتے ہیں' وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ناشکری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

انسان کسی سے محبت اس کے کمال' اس کے جمال' اور اس کے جلال کی وجہ سے کرتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی شان جلال کا اظہار' ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ شان جمال کا مظہر مجھ سے ہدایت طلب کرو' دوں گا' مجھ سے کھانا مانگو' عنایت کروں گا' مجھ سے کپڑے مانگو عطا کروں گا' مجھ سے بخشش طلب کرو' عطا کروں گا" کے کلمات ہیں۔ یہ کلمات کہ تم میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ مجھے نفع پہنچا سکے یا نقصان دے سکے اور یہ کہ میں ایسے خزانوں کا مالک ہوں جن میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آتی' اللہ کی شان عظمت و جلال اور کبریائی کے جلووں سے دل و دماغ کو منور کر رہے ہیں۔ یہ حدیث فکری' اعتقادی' اخلاقی اور عملی اصلاح کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے' شرک کی ہر قسم کا قلع قمع کرتی ہے' غیراللہ کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کرتی ہے۔ اللہ کے سامنے اپنے فقر و فاقے کے اظہار کے ساتھ دست سوال دراز کرنے کی ترغیب دیتی ہے' اللہ کی محبت و خشیت' اس کی بندگی قائم کرنے کا جذبہ' غیراللہ کی بندگی سے نفرت و بے زاری اور اللہ کے بے شمار انعامات کی وجہ سے اس کے سامنے جھک جانے' سجدہ ریز ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کے مضامین سے اللہ تعالیٰ کے بحر رحمت کی موجوں کا مراقبہ ہی نہیں' مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔

خرم مرادؒ کی وصیت

محترم خرم مراد جنوری ۹۶ میں علاج کے لیے برطانیہ گئے تھے۔ فروری ۹۶ میں انھوں نے اپنی اولاد کے لیے ایک تفصیلی وصیت نامہ تحریر کیا جو ۱۹ دسمبر ۹۶ کو ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو دیا گیا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو اسے افادہ عام کے لیے شائع کرنے کا اختیار دیا تھا۔ یہ وصیت نامہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی مسلمان پر دو راتیں ایسی نہ گزرنا چاہییں کہ اس کے پاس وصیت کے قابل اشیا اور امور کے بارے میں لکھی ہوئی وصیت موجود نہ ہو (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)۔ میں یہ وصیت حضورؐ کے اسی ارشاد کی تعمیل میں لکھ رہا ہوں۔

موت سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے' کہیں بھی آسکتی ہے' اچانک بھی آسکتی ہے' اس طرح بھی آسکتی ہے کہ کوئی پاس نہ ہو' پاس ہوں تو اہل و عیال نہ ہوں' ہوں بھی تو ان سے کچھ کہنے کا موقع نہ ملے' اور کسی چیز کے بارے میں وصیت کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ لَوْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (نوح ۷۱ : ۴۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ کاش تمھیں اس کا علم ہو) اور فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَۃً وَّلَآ اِلٰٓی اَھْلِھِمْ یَرْجِعُوْنَ (یٰسٓ ۳۶:۵۰۔ اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے' نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے)۔ موت آتی ہے تو دنیا کی ہر چیز سے ہر قسم کے روابط اور تعلقات بالکل منقطع ہو جاتے ہیں' کسی چیز پر کوئی قدرت باقی نہیں رہتی' ہر قسم کے معنوی اور مادی اسباب و وسائل چھوٹ جاتے ہیں' کسی چیز کے بارے میں کسی تصرف کا اختیار نہیں رہتا۔

وصیت ہروقت تیار رکھنے کی ہدایت اس لیے ہے کہ تمام امور و معاملات بہ حسن و خوبی سلجھ سکیں' حقوق اور دیون کی ادائیگی کا بندوبست ہو سکے' امانتیں ادا ہو سکیں' اور حتی الامکان وہ چیزیں انجام پا سکیں جو انسان چاہتا ہے۔

وصیت ہروقت تیار رکھنا اس بات کی مسلسل یاد دہانی کے لیے بھی مفید ہے کہ ایک دن سے زیادہ' آج کے دن کے بعد' زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کہ وہ رہے گی یا نہیں۔ اس یاد دہانی سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ جسؐ کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دی ہے: صبح ہو تو شام کی امید نہ رکھو۔ شام ہو تو صبح کی نہ

رکھو۔ دنیا میں ایک مسافر یا راہ گیر کی طرح رہو۔

لیکن افسوس کہ سب جانتے اور بوجھتے بھی سستی اور ٹال مٹول ایسی غالب رہی کہ صبح ہوتی رہی اور شام ہوتی رہی مگر وصیت لکھنے کی نوبت آ رہی ہے تو آج--- آج جب کہ عمر کی ۶۳ منزلیں گزر چکی ہیں' اور موت' جو کبھی بھی کچھ دور نہ تھی' مسلسل قریب آتی رہی ہے' اور اب تو بہت ہی قریب آ گئی ہے۔ (یہ افسوس اور ندامت اس لیے کہ میرا معاملہ ہر عام آدمی کی طرح کا معاملہ نہیں' جسے وصیت تیار رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ پہلے ہارٹ اٹیک کے بعد' جو نومبر۱۹۶۶ میں ہوا اور سب سے سخت اٹیک تھا' اللہ تعالیٰ نے مجھے اب تک ۳۰ سال کی بونس عمر دی ہے' مہلت دی ہے۔ اس طویل مدت میں' میں ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ مسلسل روز بروز بڑھتے ہوئے موت کے خطرے کی زد میں رہا ہوں۔ اس مدت میں مزید چار ہارٹ اٹیک ہوئے' تین دفعہ ایمبولینس میں انتہائی نگہداشت میں گیا جس سے واپسی کا امکان کم ہی ہوتا ہے' ۲۰ سال سے انجائنا ہے' ۴ دفعہ اینجیو گرافی ہو چکی ہے' دو دفعہ بائی پاس سرجری ہو چکی ہے' صرف بائی پاس نہیں بلکہ والو کی وجہ سے اوپن ہارٹ سرجری ہوئی' ایک والو پلاسٹک کا ہے۔ ۱۹۹۱ کے ہارٹ اٹیک کے بعد انجائنا برابر بڑھ ہی رہا ہے' اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ تیسری سرجری کے بارے میں سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے۔ دو ہفتے لاہور میں قلب کے وارڈ میں گزار کر اب انگلینڈ میں ہوں۔ ۸ فروری کو پھر اینجیو گرافی پیشِ نظر ہے تاکہ آیندہ کا لائحہ عمل طے کیا جا سکے--- جو تقریباً یقینی ہے کہ آپریشن ہی ہوگا۔ اِلاَّ مَاشَاءَ اللّٰہ۔ میں بظاہر مذاق میں کہتا رہا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے اور میری میڈیکل ہسٹری چھپے' تو لوگوں کو تعجب اس پر نہیں ہوگا کہ یہ کیوں مرگیا' بلکہ ہوگا تو اس پر ہوگا کہ یہ اب تک زندہ کیسے رہا۔

لیکن اس سب کے باوجود بھی وصیت نہ لکھی جا سکی! یہ غفلت کچھ وصیت کے معاملے ہی میں نہیں ہے۔ ساری بد عملیوں اور محرومیوں کا حال یہ ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ہوتی رہی ہیں۔ انھی کوتاہیوں کی نذر عمر کا بیش تر سرمایہ وقت ہو گیا ہے۔

ایسا نہیں کہ سستی اور ٹال مٹول کی اس طویل مدت کے دوران میں' موت سے بالکل غافل' یا وصیت لکھنے کی فکر سے خالی رہا ہوں۔ موت کو یاد رکھنے کی کوشش بہت عرصے سے رہی ہے۔ ۱۹۸۲ کے بعد اور زیادہ۔ گذشتہ ۵ سالوں میں تو وقتاً" فوقتاً" یہ مراقبہ بھی کرتا رہا ہوں کہ ایک سانس آئی' پتا نہیں دوسری آئے گی یا نہیں' آئے گی تو اللہ کے اذن سے۔ ایک دفعہ دل دھڑکا' دوسری دفعہ دھڑکے گا یا نہیں پتا نہیں' دھڑکے گا تو اللہ کے حکم سے۔ رات کو سوتے ہوئے موت کو یاد کر کے ہی' بھول نہ جاؤں تو یہ کہتا ہوں کہ اِنْ اَمْسَکْتَھَا فَارْحَمْھَا (اگر تو اس کو روک لے تو اس پر رحم فرما)۔ ۱۹۸۲ کے آپریشن سے پہلے تم سب کے نام' دوسروں کے نام بھی' خط بھی لکھ لیے تھے اور وصیت بھی نرس کے حوالے کر دی تھی۔ گذشتہ ایک

سال سے تو مسلسل فکر لگی رہی ہے۔ لیکن بس لکھنے کے دوسرے کام اتنا وقت لیتے رہے کہ نوبت نہ آئی۔ لاہور کے ہسپتال میں تو لکھنا شروع کر دی تھی' لیکن پھر سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب یہاں فاروق کے گھر میں آج ۲۷ جنوری ۱۹۹۶ کو نئے سرے سے لکھنا شروع کر رہا ہوں۔ "ترجمان القرآن" کا کام اب بھی سر پر ہے۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے مکمل کروا ہی دے۔

عمومی توصیات

مجھ سے جدائی پر تمھیں جو رنج و غم ہوگا' اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ جتنی محبت ہوتی ہے اور تعلق ہوتا ہے' اتنا ہی جدائی پر رنج و غم زیادہ ہوتا ہے۔ تم کو مجھ سے جس قدر محبت ہے' اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ اس لیے تمھیں جس قدر رنج و غم ہے' اس میں بھی مجھے کوئی شبہ نہیں۔ اس بارے میں چند باتیں سامنے رکھو' اور ان پر عمل کرو' اللہ تعالیٰ اس معاملے کو تمھارے لیے اور میرے لیے ابدی خیرو برکت کا ذریعہ بنا دے گا۔ تمھیں اپنی کیفیات پر قابو پانے میں بھی مدد ملے گی۔

۱۔ دل کا غم' اللہ کی اس رحمت کی برکت ہے جو اس نے تمھارے دل میں رکھ دی ہے۔ دل کی رقت اور آنکھوں کے آنسو بھی اس کی رحمت کا فیضان ہیں۔ اس غم کو اور اس نمی کو اللہ کا عطیہ سمجھو۔ دل کی ایسی سختی کہ وہ حوادث پر پگھل کر نہ دے' اور آنکھوں کی ایسی خشکی کہ وہ بہہ کر نہ دیں' اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی کی علامت ہے۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا: یہ مرہم کا کام بھی کرے گی' سہارے اور اجر کا باعث بھی بنے گی۔

۲۔ حضورؐ نے خود بالکل ایسے ہی موقع کے لیے فرمایا' جب آپؐ خود ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھے: بے شک ہم جدائی پر غمگین ہیں' آنکھیں غمناک ہیں' لیکن اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں۔ حضورؐ کے اس سہارے میں تسلی اور صبر کا سامان بھی پاؤ گے' اور رنج و غم کی وہ حد بھی جہاں تم کو رک جانا چاہیے۔ رنج و غم میں بھی حضورؐ کے اتباع کی نیت ضرور رکھنا۔ آپؐ سے قربت نصیب ہوگی' جو خود تسلی اور سہارے کا بڑا سامان ہے۔ پھر اس غم و اندوہ کا اجر بھی ملے گا' اور اللہ کی محبت بھی نصیب ہوگی۔ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اور یہ قیمتی ہدایا کچھ نہ کچھ مجھے بھی پہنچیں گے' اِنْ شَآءَ اللّٰہ۔

۳۔ جو چیزیں اللہ کو پسند نہیں' اس کو ناراض کرتی ہیں' انھیں بھی یاد رکھنا' اور ان سے بچنا' یہ باتیں ایمان کے منافی ہیں ––– دل اور آنکھ تمھارے اختیار میں نہیں' ان کو روکنا اور تھامنا ضروری بھی نہیں' بلکہ

یہ کیفیات اللہ کا عطیہ ہیں۔ لیکن زبان کو تھامنا ضروری ہے۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے۔ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکلے جو رضا بالقضا کے خلاف ہو۔ جزع و فزع نہ ہو، گلہ شکوہ نہ ہو، یاس و حسرت نہ ہو۔ یہی روش تمھاری طرف سے میرے لیے سب سے پہلا بیش قیمت ہدیہ ہو گا، جو ان کٹھن مقامات پر میرے بہت کام آئے گا، جن سے آنکھ بند ہوتے ہی مجھے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور ان شاء اللہ، تمھارے لیے بھی بے معنی اور لاحاصل کلمات کے مقابلے میں یہ طرزِ عمل زیادہ سے زیادہ اجر کا باعث ہو گا۔

۴۔ سب سے بڑھ کر اس بات کی نگہداشت کرنا کہ زبان سے کوئی لفظ حسرت کا ہرگز نہ نکلے، نہ دل کسی حسرت میں مبتلا ہو۔ یہ تو ہرگز نہ کہنا، نہ سوچنا کہ "اگر! کاش.... ایسا ہوتا.... ایسا نہ ہوتا، تو یہ نہ ہوتا"۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "لو (کاش، اگر) شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ کافروں کا قول ہے۔ تم ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا، اور سفر یا لڑائی میں مرنے والے پیاروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اگر (نہ جاتے) ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے، نہ قتل کیے جاتے۔ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران ۳:۱۵۶۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے)۔

۵۔ یہ سوچ، اور یہ گفتگو، صرف حسرت کی سوزش کا سامان اس لیے بھی ہے کہ جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، وہ اب کسی صورت پلٹایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے بھی ہے کہ جو کچھ ہونا تھا، وہ اسی طرح، اسی وقت اور اسی مقام پر ہونا تھا، پہلے سے کوئی بھی تدبیر کر لی جاتی تو بھی اس سے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہ دو باتیں اچھی طرح یاد رکھو گے تو رضا بالقضا کی آدھی کیفیت تو حاصل ہو جائے گی۔

بار بار یاد کرنا، خود کو، سب کو یاد دلانا، کہ حکم، تدبیر اور تصریف صرف اللہ کے لیے ہے۔ اسباب جو نگاہوں سے نظر آتے ہیں، اس کی تدبیر کا ذریعہ ہیں۔ جو اللہ کی معرفت سے تہی دامن ہے، اس کی نگاہ انھی اسباب میں اٹک جاتی ہے، یہی اسباب اس کے اور رب کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔

ورنہ جو کچھ پیش آتا ہے، اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (التغابن ۶۴:۱۱۔ کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے)۔ یہی دل کو سیدھا رکھنے کا نسخہ ہے: وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (التغابن ۶۴:۱۱۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے)۔ جو مصیبت پڑ گئی، ٹل نہ سکتی تھی، جو نہیں پڑی، وہ پڑ نہیں سکتی تھی۔ سارے جن و انس مل کر بھی کوئی نقصان روکنا چاہیں، کوئی نفع پہنچانا چاہیں، تو کچھ نہیں کر سکتے)۔ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ (قلم

اٹھا لیے گئے اور کتابیں خشک ہو گئیں)۔ خاص طور پر موت۔ کوئی بھی اللہ کے حکم کے بغیر' اس کی لکھی ہوئی مدت سے ایک لمحہ پہلے یا بعد نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت آ جائے' کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ سبب کوئی بھی ہو۔ جہاں مرنا ہو گا' اور جس طرح مرنا ہو گا' اسی کی طرف کشاں کشاں لے جایا جائے گا۔ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران ۳: ۱۵۴۔ جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے)۔ جب ہر چیز پہلے سے لکھی ہوئی ہے' تو کسی بھی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے پر یاس و حسرت کا شکار کیوں بنو۔ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا' مقام ابراہیم کی دعا بھی ہے' اور تسلیم و رضا کے مقام ابراہیمی کے حصول کا بڑا موثر ذریعہ بھی۔ اگر اب تک نہیں مانگتے رہے ہو تو اب باقاعدگی سے مانگنا شروع کر دو۔ بہت مفید پاؤ گے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا يُّبَاشِرُ قَلْبِیْ وَيَقِيْنًا صَادِقًا حَتّٰى اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَنْ يُّصِيْبَنِیْ اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِیْ وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِیْ۔ (اے اللہ میں تجھ سے ایسا ایمان مانگتا ہوں جو دل میں سرایت کر جائے' اور سچا یقین' یہاں تک کہ میں یہ جان لوں کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی' سوائے اس کے جو تو نے میرے لیے لکھ دی' اور راضی ہو جاؤں اس پر جو تو نے میری قسمت میں کر دیا)۔

وہی پڑا جو اس نے لکھ دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر' یہ بھی یاد کرنا کہ جو کچھ اس نے لے لیا وہ اسی کا تھا' اس لیے کہ اسی کا دیا ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے دیا تھا' وہ عارضی مدت کے لیے ہی دیا تھا: متاعًا الی حین۔ اسے بہرحال فنا ہو جانا تھا: کل من علیها فان۔ پھر اس پر حسرت و یاس کا کیا سوال' اور جزع و فزع کس لیے؟ بس یہ پڑھو کہ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلِلّٰهِ مَا اَعْطٰى اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

مجھ سے جدائی ہی کے معاملے میں نہیں' دنیا کی کسی بھی چیز' محبوب سے محبوب چیز' سے جدائی' اس کے چھن جانے' اس کے نہ ملنے پر' اپنے دل' سوچ اور زبان کو انھی تعلیمات سے ساتھ باندھے رکھنا۔ تم ان میں طمانیت اور سکینت کا ایک اتھاہ اور لازوال خزانہ پاؤ گے۔ دنیا کے تمام غم زائل ہو جائیں گے' تمھاری جھولی طمانیت و سکون سے بھر جائے گی۔ اجر بھی بے حد و حساب پاؤ گے۔ اس لیے کہ یہی صبر کی اصل ہے۔ اور اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ۳۹: ۱۰۔ صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا)۔

۶۔ میں اپنے بارے میں رضا بالقضا اور حسرت و یاس سے اجتناب کی تم کو اس شدت کے ساتھ تاکید'

دو وجوہ سے کر رہا ہوں:

ایک : اس لیے کہ سلسلہ اسباب و علل کے تحت بظاہر قوی امکان اسی بات کا ہے کہ میری موت دل کے عارضے کی وجہ سے واقع ہو۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ دل کی اتنی طویل بیماری کے باوجود اللہ نے کوئی دوسرا سبب لکھا ہو گا' تو وہی باعث ہو گا۔ ہو سکتا ہے مہلت ملے' ہو سکتا ہے نہ ملے۔ کسی شغل یا مصروفیت کے درمیان' یا اس کے فوراً بعد ایسا ہو۔ ایسی صورت میں سب کی نگاہ فوری سبب پر جاتی ہے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ "یہ نہ کر رہے ہوتے' نہ کرتے ہوتے تو......" نگاہ رب الاسباب پر نہیں جاتی۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ مَاشَاءَ اللّٰهُ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ میری تم کو یہی نصیحت ہے کہ اپنی نگاہ' طبعی سبب سے مکمل طور پر ہٹالو' فوری سبب ہو یا طویل بیماری اور میری مشغولیات کا سبب' اور صرف پردۂ غیب کے پیچھے مستور لیکن چشم دل و بصیرت کے سامنے عیاں' فاعل حقیقی کے اوپر جمالو۔ سبب اور بہانہ کوئی بھی بن سکتا تھا' حادثہ بھی ہو سکتا تھا' لیکن جو کچھ ہوا' وہی ہونا تھا' اسی وقت ہونا تھا اور اسی طرح ہونا تھا۔ جو کچھ کیا اللہ نے کیا: مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَاْ لَمْ يَكُنْ (جو اس نے چاہا ہو گیا اور جو نہیں چاہا نہیں ہوا)۔ میں تو عرصے سے روز صبح وہ دعائیں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں' جن میں یہ کلمہ شامل ہے۔ تم بھی پڑھا کرو اور ہر فرض نماز کے بعد' حضورؐ کے اتباع میں' یہ دعا بھی:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ایک ہے' کوئی اس کا شریک نہیں' بادشاہی اس کے لیے ہے' تعریف اس کے لیے ہے' وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ' جو تو عطا کرے' اسے روکنے والا کوئی نہیں' اور جو تو روکے' اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں)۔

خاص طور پر آج کے اس مادی دور میں---- جب ہر بات کی تعبیر مادی اسباب ہی سے کی جاتی ہے---- اس شرک خفی سے بچنے کا نسخہ یہی ہے کہ دل و نگاہ کا مرکز مَاشَاءَ اللّٰهُ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کو بنائے رکھو۔ صبر کا بھی سب سے کارگر نسخہ یہی ہے۔ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

دوسری وجہ : جو زیادہ اہم ہے' وہ یہ ہے کہ اس کا بھی بہت امکان ہے کہ فوری وجہ اللہ کے کسی کام میں مشغولیت ہو: تقریر کرتے ہوئے' کچھ لکھتے ہوئے' کسی اجتماع میں بیٹھے ہوئے' کسی سے ملاقات کرتے ہوئے' معمول کے مطابق یا غیر معمولی طور پر کسی مصروفیت اور مشغولیت کے دوران۔ اگر سبب اللہ کا کام ہو' فوری ہو یا مستقل' تو اس کام کو موردِ الزام گرداننا' نہ صرف فاعل حقیقی سے نگاہ کو ہٹالینا ہو گا' بلکہ جو کام اس کو محبوب ہے' اس کی طرف سے دل میں تنگی اور زبان پر الزام وہی' اس کو ناراض کرنے کا سبب بھی بن سکتی

ہے۔ اب بھی عموماً جماعت، جماعت کے کاموں اور جماعت کے لوگوں پر الزام رکھ دیا جاتا ہے۔ اب بھی تدابیر میں سرفہرست اسی کام کو کم کرنے کو رکھا جاتا ہے۔ آرام کے معنی اسی کام سے آرام کے ہوتے ہیں، اور دنیا کی دیگر بے شمار ذہنی مصروفیات اور ہجوم و افکار کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ مجھے یہ اب بھی ناگوار ہوتا ہے، اور ڈر لگتا ہے کہ اللہ کو بھی ناگوار نہ ہو۔ اس لیے اس موقع پر میں شدت سے یہ تاکید کروں گا کہ تمھاری طرف سے ایسی کوئی بات نہ کہی جائے، نہ سوچی جائے، دوسرے کہیں تو اس کی تردید کی جائے۔ ہاں، دل میں آجائے تو کوئی بات نہیں۔

اگر اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے، کوئی کام فراق کا فوری سبب بنے تو اس پر تو اللہ کا شکر بجا لانا چاہیے۔ میری تو اب دعا یہی ہے کہ اگر شہادت نصیب میں نہ ہو تو کم سے کم موت اس کا کام کرتے ہوئے آئے۔ شاید یہ آن ڈیوٹی (on duty) موت بھی کسی درجہ میں شہادت میں شمار ہو جائے۔ قتل کے ساتھ الگ سے موت کے ذکر کے کچھ معنی تو ہیں: وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ (آل عمران ۳:۱۵۷)۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں)۔

مجھے تو اس بات کا یقین ہے کہ اگر مجھے آج تک تیس سال کی مہلت ملی ہے، اور اتنے ہارٹ اٹیک اور آپریشنوں کے باوجود ملی ہے، اور اتنی سہولت سے ملی ہے کہ دو آپریشن بالکل بلا کسی خرچ کے ہو گئے، اور اس طرح ملی ہے کہ میں ایک نارمل آدمی سے زیادہ ہی بھرپور کام کرتا رہا ہوں، تو اس کا سبب وہی برکت ہے جو اللہ کا کام کرنے سے حاصل ہوئی ہے، برا بھلا جیسا بھی کرتا رہا ہوں۔ بلکہ سوچتا ہوں تو جتنا بھرپور کام اور نتیجہ خیز وقت ان تیس سالوں میں گزرا ہے، وہ اس سے پہلے نہیں ہو سکا۔ بلکہ تحریر کا تو تقریباً سارا کام ۱۹۸۱ کے بعد ہوا ہے، جب لیسٹر (برطانیہ) میں دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا اور اینجیو گرافی اور آپریشن کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی جو مہلت ملے گی وہ اسی لیے کہ میں اس کا کام کرتا رہوں۔ بلکہ مہلت کم ہو اور وہ کام میں گزرے، یہ مجھے زیادہ محبوب ہے اس کی بہ نسبت کہ مہلت زیادہ ہو اور سارا وقت احتیاط، آرام اور کچھ نہ کر سکنے میں گزر جائے۔

۷۔ صبر سے آگے تسلیم و رضا کا ایک مقام اور ہے، اور وہی اصل رضا بالقضا ہے۔ اس پر بھی اپنی نگاہ جمانے کی کوشش کرو۔ وہ یہ کہ ہر مصیبت میں خیر دیکھو جو اللہ تعالیٰ نے اس میں تمھارے لیے رکھ دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ خیر محض ہے: وَبِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَلَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ۔ اور ہر تدبیر، تقدیر، قضا اسی کی طرف سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھاری محدود نگاہ اس خیر کو فوراً نہ دیکھ سکے۔ ایک خیر تو یہ ہے کہ تم صبر کرد

گے' اللہ کا قرب اور معیت پاؤ گے' دنیا اور آخرت کی اعلیٰ ترین اور بیش بہا نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہو گے۔ مصیبت نہ پڑتی تو یہ سب کچھ کیسے حاصل ہوتا! غور کرو تو نہ اس فانی دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت' نعمت حقیقی ہے' نہ یہاں کی بڑی سے بڑی مصیبت حقیقی معنوں میں مصیبت ہے۔ ایک تو ہر ایک کو گزر جانا ہے۔ دوسرے جس نعمت پر اللہ کا شکر نہ ہو' وہ ایک مصیبت ہے' کہ جس دن لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ کا منظر ہو گا' وہ بلائے جان بن جائے گی۔ اور جس مصیبت پر اللہ کے لیے صبر ہو' وہ ایک نعمت ہے' کہ اس کا بیش بہا اجر ہمیشہ کے لیے ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا: مومن کا معاملہ بھی کیا خوب ہے! نعمت ملتی ہے تو شکر ادا کرتا ہے اور لازوال اجر پاتا ہے--- مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتا ہے اور لازوال اجر پاتا ہے۔ تم دونوں حالتوں میں یہی اجر لوٹنے کی کوشش کرنا۔ اس کیفیت اور اجر میں سے جو نصیب ہو جائے اس پر خوشیاں منانا' جو ہاتھ سے نکل جائے اس پر غم منانا' نہ کہ دنیا کی فانی نعمتوں کے نہ ملنے یا مصیبتوں کے پڑنے سے۔

ہر مصیبت میں تمھارے لیے تزکیہ و تربیت کا سامان بھی ہے اور اگر تم اسے اللہ کی طرف سے دیکھنے لگو جو كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ہے' تو ہر مصیبت اس کی عطا ہے' لقائے دوست کا سامان ہے' اس سے ملاقات اور قرب کا ذریعہ' اور اس لیے جائے شکر بھی۔

۸۔ رضا بالقضا مجبوری کا معاملہ نہیں کہ جو ہونا تھا' وہ ہو گیا۔ بلکہ اس پر رضامندی اور پسندیدگی کا معاملہ ہے' اور اس کے بدلے میں اجر کی توقع اور اس کی لذت کی خوشی کا معاملہ ہے۔ غم تو تعلق ٹوٹنے کا ہے' باہمی محبت کی لذت' قربت کی لذت' ساتھ بیٹھنے کی لذت' بات چیت کی لذت' ختم ہو جانے کا غم ہے۔ لیکن اس سے کوئی مفر نہیں کہ یہ ختم ہو جاتی' آج نہ ہوتی تو کل ہوتی۔ لیکن انھی لذتوں کا پکا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے' صبر اور تقویٰ کرنے والوں سے۔ ایسی لذت جس کا تصور بھی تم نہیں کر سکتے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (السجدہ ۳۲: ۱۷۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے چھپا رکھا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں)۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والی۔ نَعِيمٌ مُّقِيمٌ۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔

دیکھو' آج جو چیز ختم ہو گئی' اسی کا وعدہ ہے کہ کل ملے گی۔ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ میں باہم مل بیٹھنے کی لذت۔ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ میں دلچسپ و لذیذ مشغولیتوں کی لذت۔ خاص طور پر بیویوں اور اولاد کے ساتھ: هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ (یٰسٓ ۳۶: ۵۶۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں' مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے)۔ اس لذت کے مقابلے میں وہ عارضی لذت کیا مقام رکھتی ہے' جو آج ہم اور

تم سے لے لی گئی ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے لیے کوشاں رہو، تو بس اللہ کا قطعی وعدہ ہے۔ حساب آسان ہو گا، پھر ملیں گے، ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (الطور ۵۲: ۲۱۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) ان کے ساتھ ملا دیں گے) کا وعدہ۔ وَیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا، اپنے اہل وعیال کی طرف شاداں و فرحاں، کامیاب و بامراد واپسی کی لذت کا وعدہ۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ (الرعد ۱۳: ۲۳۔ یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے، وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباو اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے) کا وعدہ۔

۹۔ میں نے معروف معنوں اور انداز میں تمھیں صبر کی تلقین نہیں کی ہے، نہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اب تک جن باتوں کی وصیت کی ہے، ان کے ذریعے صبر کی عظیم شاہراہ کو تمھارے لیے آسان اور وسیع کر دیا ہے، اس کے دروازوں کی کنجیاں تمھارے ہاتھوں میں تھما دی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کنجیوں سے صبر کے، اور اس طرح جنت کے، دروازے خود اپنے لیے کھول لو گے، اور سہولت کے ساتھ اس راہ پر چلو گے۔ اس موقع ہی پر نہیں، ساری زندگی میں سکون و طمانیت اور کامیابی و سرفرازی کا راز صبر ہی میں پوشیدہ ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف ۷: ۱۳۷۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا، کیونکہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا)۔

جہاں تک موت کے سلسلے میں میری کیفیت کا تعلق ہے، وہ میں بتا دوں۔ آج کا حال یہی ہے، کل کیا ہو گا، یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس کی پسندیدہ کیفیت ہو تو وہ اسے باقی رکھے اور بڑھائے، ناپسندیدہ ہو تو اصلاح کر دے۔

اول: موت کا ڈر ایک فطری کیفیت ہے۔ میں اس سے کبھی خالی نہ رہا، آج بھی نہیں ہوں، شاید مرتے وقت بھی نہ ہوں گا۔ موت کی تکلیف کا ڈر، موت کے بعد کے مراحل کی تکلیف کا ڈر۔ طبعی خوف و ڈر سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ پیغمبروں کو بھی نہیں۔ حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے تو خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ، خوف زدہ ڈرتے اور سہمتے۔ عصا سانپ بن گیا، تو ڈر کے مارے الٹے پاؤں پھرے۔ نزع کی تکلیف تو اسی دنیا کی تکلیف ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایات حضورؐ کے بارے میں، انسانیت موت کے دروازے پر! میں جو پڑھا ہے، دل سوچ کر ڈرتا ہی ہے۔

دوم: اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ باقاعدگی سے' اَلشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِکَ کی دعا کرنے اور اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِکَ الْکَرِیْمِ کی لذت طلب کرنے کے باوجود' اس کی کیفیت سے آشنائی نہیں ہوئی۔ موت کا سوچ کر ہی' جو لقاء اللہ کا دروازہ ہے' خوف شوق پر غالب آ جاتا ہے' اور اس کے کریم چہرے پر نظر کی لذت کی آرزو بھی اس پر حاوی نہیں ہونے پاتی۔ یا شاید یہ پتا ہی نہیں کہ طبعی خوف کے ساتھ عقلی شوق و لذت کی کیفیت کس طرح جمع ہو سکتی ہے۔ کچھ سہارا ملتا ہے تو حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے' جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضورؐ نے فرمایا: جو اللہ سے ملاقات سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی اس سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے' اور جو اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے' اللہ بھی اس سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فوراً موت کے لیے اپنی طبعی کراہیت کا سوال کھڑا کر دیا: ہم میں سے ہر شخص موت کو ناپسند کرتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: میرا مطلب یہ نہیں' بلکہ جب مومن کو اللہ کی نعمت' رضا اور جنت کی بشارت دی جاتی ہے تو اللہ سے ملاقات اس کو محبوب ہو جاتی ہے (او کما قال)۔ لیکن میں جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہوں تو بشارت کی امید کم ہی ہوتی ہے' محبت اور شوق پر خوف ہی غالب آ جاتا ہے۔ پھر بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح یہی دل کی صدا ہوتی ہے: رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (القصص ۲۸:۲۴۔ پروردگار' جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں)۔ شاید شوق میں مانع موت کا ڈر اتنا نہیں' جتنا اپنے اعمال بد کا ڈر ہے۔

سوم: دنیا کی حد تک آج تو کم و بیش کیفیت یہ محسوس ہوتی ہے کہ کسی بھی چیز کے چھوٹ جانے کا غم اس طرح نہ لگے گا کہ ستائے گا' وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔ دنیا میں بھی اب کسی مادی نقصان کا کوئی روگ جان کو نہیں لگتا۔ کوئی ایسی آرزو اور خواہش نہیں کہ جس کے پورا نہ ہونے پر حسرت اور افسوس ہو۔ بلکہ اب تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی رقم ہاتھ آ جائے تو اپنا کون سا شوق ہے جو پورا کروں گا' سوائے اس کے کہ دوسروں کے شوق پر خرچ کر دوں' یا اللہ کی راہ میں دے دوں۔ یا کسی کے لیے کچھ اپنے بعد کا انتظام کر دوں۔

ہاں' اگر کچھ تعلق لگتا ہے تو ایک' ان چیزوں سے جو بولی یا لکھی ہوئی موجود ہیں' مگر طباعت کے قابل نہ بنا سکا۔ یا وہ جو دل و دماغ میں ہیں' نہ لکھ سکا' نہ بول سکا۔ یا دوسرے' ان کا خیال ہے جن کی ساری خوشیوں کا انحصار ہی میرے اوپر ہے کہ ان کی گزر کیسے ہو گی۔ یا ان کا جن کا بظاہر میرے بعد کوئی بندوبست نظر نہیں آتا۔ دونوں صورتوں میں اطمینان' اللہ پر بھروسے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اور نہ معلوم کتنے لوگ' مجھ سے کہیں بہتر' ناتمام خیالات اور مسودات چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ جب اللہ ہی کو منظور نہیں تو مجھے کیا فکر کرنا۔ اب تک جو چھپ گیا اس نے کیا تیر مار لیا اور جو بہترین کتابیں موجود ہیں دوسروں کی' ان سے ہی کیا حاصل ہو رہا ہے۔ اور کیا پتا' جس طرح ۱۹۸۱ کے بعد بہت مدت گزر گئی' اللہ تعالیٰ نے آج کے بعد بھی

رہا۔ عملاً کچھ نہ کر سکا مگر اس سے مانگتا تو رہا۔ اب آج' جو کچھ مانگتا رہا' اسی کی وصیت اور تاکید تم کو کر رہا ہوں۔ جو کچھ میں تمھیں بنتا دیکھنا چاہتا رہا ہوں' وہی تم بننے کی کوشش میں لگے رہو' یہی میری آخری تمنا ہے اور وصیت ہے۔

میرا دل اس پر شاہد ہے کہ میں نے جو کچھ مانگا تھا اللہ تعالیٰ نے تمھیں وہ بہت کچھ دیا۔ اسی لیے مجھے پوری امید ہے کہ آیندہ بھی وہ میری دعا اور تمھاری کوشش سے بہت کچھ عطا کرے گا' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا کو میں پہلے اس لیے رکھتا ہوں کہ دنیا ہی دین اور آخرت کی کلید ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا کی دعا میں اللہ تعالیٰ نے بھی اسے مقدم رکھا ہے۔

۱۔ دنیا کی حد تک میں نے سب سے پہلے جو چیز مانگی ہے' وہ یہ ہے کہ اللہ تمھیں غنائے قلب کی دولت عطا کرے' دل کو دنیا سے بے نیاز رکھے۔ دیکھو' دین و دنیا کی اصل دولت یہی غنائے نفس ہے۔ ساری بھلائیوں کا سرچشمہ یہی ہے۔ ساری برائیوں کی جڑ یہی حب دنیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں میرا احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب کو کسی نہ کسی درجے میں عطا کی ہے۔ گویا میری دعا قبول فرمائی ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے اور دوسری دعائیں بھی قبول ہوئی ہوں گی' وہ جو میرے اپنے بارے میں ہیں۔

جتنی یہ دولت تمھیں مل گئی ہے اس کی قدر کرنا' اس کی حفاظت کرنا' اس کو بڑھانے کی کوشش کرنا۔ جہاں کمی ہو' خلا ہو' اسے بھرنا۔ زہد ترکِ دنیا نہیں' ترکِ محبوبیتِ دنیا ہے۔ دنیا کی حلال و طیب نعمتوں سے لطف اٹھاؤ' لیکن کسی کے اسیر نہ بنو' کسی کے ساتھ دل نہ لگاؤ۔ اچھا کھاؤ' اچھا پہنو' اچھی طرح رہو' دولت بھی رکھو' کماؤ بھی' مگر کسی کے ساتھ دل نہ اٹکاؤ۔ ان کا ہونا نہ ہونا یکساں ہو جائے' اسی کی کوشش میں رہو۔ اللہ تعالیٰ فراخی عطا کرے تو بلا تامل اس کی عطا سمجھ کر سینہ سے لگاؤ۔ تنگی میں ڈالے تو بھی اس کی عطا سمجھ کر شکر ادا کرو۔ لذیذ کھانا سامنے ہو' سوکھی روٹی ہو' یا فاقہ کی نوبت' ہر ایک کو اس کا عطیہ سمجھو' ہر ایک حالت میں لطف اور مزہ لو۔ جب دل دنیا سے بے نیاز ہو گا' تو دنیا کی خاطر اس اللہ کی نافرمانی کیوں کرو گے جس کے تم ہمہ تن و ہمہ دل و ہمہ دم محتاج ہو۔ پھر اس دنیا کے چھن جانے پر' یا نہ ملنے پر رنج و غم کا کیا سوال! بس دنیا کی خاطر اللہ کی ناراضی مول نہ لینا' نہ کبھی دنیا کی خاطر جان کو غم کا روگ لگانا۔

۲۔ دنیا کی حد تک دوسری چیز میں نے یہ مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں کسی مخلوق کا محتاج نہ بنائے' صرف اپنا محتاج بنائے' کسی انسان کا دستِ نگر نہ بنائے' صرف اپنا دستِ نگر بنائے' کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے' صرف اپنا سائل بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصحابؓ سے خاص بیعت لی تھی کہ کسی سے سوال نہ کرنا۔ سواری پر سے ان کا کوڑا بھی گر جاتا تو وہ خود اتر کر اٹھا لیتے' کسی سے

درخواست نہ کرتے۔ میں اس پر عمل تو کماحقہ' کبھی نہ کر سکا' لیکن یہی میرا آئیڈیل رہا ہے۔ تمھارے لیے بھی یہی آئیڈیل ہونا چاہیے۔ حتی الامکان تم اس پر عمل کی کوشش کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ساری امیدیں صرف اللہ پر رکھو' لوگوں کے پاس جو کچھ ہے' ان کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے' اس سے ساری امیدیں قطع کر لو۔ وَاجْمَعِ الْيَاسَ مِمَّا فِيْ اَيْدِي النَّاسِ۔ اَللّٰهُمَّ اقْذِفْ فِي قَلْبِيْ رَجَاءَكَ وَاقْطَعْ عَنِّيْ رَجَاءَ لِمَنْ سِوَاكَ۔ (اور انسانوں کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے' اس سے پوری طرح مایوس ہو جاؤ۔ اے اللہ' میرے دل میں صرف اپنے سے امید ڈال دے' اور اپنے علاوہ کسی دوسرے سے امید ختم کر دے) انسانی تعلقات کی بیش تر خرابیاں' اور زندگی کی بیش تر ناخوشیاں شکستہ توقعات (broken Expectations) کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح تعلقات بھی فساد سے پاک ہو جائیں گے' ناخوشیوں سے بھی نجات ملے گی۔

۳۔ تیسری چیز میں نے یہ مانگی ہے کہ وہ دنیا میں تمھیں حلال و طیب رزق خوب وسعت سے دے' کم سے کم اتنا ضرور دے کہ تم فارغ البالی کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کر سکو' قناعت کے ساتھ خوش رہو اور دنیا سے حظ بھی اٹھا سکو۔

اتنی دنیا' دین کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ دنیا سے اتنا حصہ لینے سے غفلت اور لاپروائی نہ برتنا۔ یہ عبادت میں داخل ہے' اور دوسری عبادتوں کے حسن کے لیے ضروری۔ اس لیے اس حد تک دنیا کمانے کو عبادت سمجھ کر ہی کام کرنا۔ لیکن یہ بھی یقین رکھنا کہ جتنا ملنا ہے' وہ ضرور ملے گا۔ حرام راستوں پر جانے سے کچھ زیادہ نہ مل جائے گا۔ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ کو بھی سامنے رکھنا۔

۴۔ دنیا کے اور تلاش معاش کے' ادائیگی حقوق کے' سارے کام بھی ایک امانت ہیں' انھیں پوری امانت داری کے ساتھ کرو۔ دیانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ پوری ذمہ داری سے اپنے کام پایہ تکمیل تک پہنچاؤ۔ ہر کام کو بہتر سے بہتر طریقے سے کرو' خوب سے خوب تر کے جویا رہو۔ دنیا کے ہر کام میں بھی کامیابی کو ہدف بناؤ' اور کامیابی کے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کو۔ دین داری اس بات کا نام نہیں کہ آدمی دنیا سے لاپروائی برتے۔ ہر کام عبادت ہو گا' اگر اسے صرف اللہ کے لیے کرو گے اور معصیت سے پاک رکھو گے۔

۵۔ اصل آرزو تو یہ ہے' یہی ہے' اور یہ سب کچھ بھی اسی آرزو کی خاطر ہے' کہ اللہ کے بندے بن کر زندگی بسر کرو' مخلص اور حنیف بندے۔ بندگی یہ ہے کہ ایک طرف جو اس کی مرضیات اور اوامر و نواہی ہیں' ان کو

بھی برضا و رغبت بجالاؤ' بلکہ رضاجوئی اور محبت میں دوڑ دوڑ کر وہ کام بھی کرو' جن کو اس نے فرض نہیں کیا' مگر جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ محبت تو محبوب کے آنکھ کے اشارے کی منتظر رہتی ہے' کچھ کہے بغیر بھی اس کی مرضی پا جاتی ہے' اس کے چہرے پر نگاہ رکھتی ہے۔ اسی کیفیت کا اظہار نماز کے بعد تین دفعہ اس اظہار و اقرار سے ہوتا ہے: رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

جس نے یہ کیفیت حاصل کر لی' اس نے ایمان کا ذائقہ پا لیا' ذاق طعم الایمان۔

دوسری طرف جو اس کے تکوینی فیصلے ہوں' ان پر بھی راضی رہو۔ یعنی وہ جس طرح کہے' اس طرح خوشی خوشی کرو' اور جس طرح رکھے اس طرح خوشی خوشی رہو: رِضَا بِمَا قَسَمْتَ لِی کی اس کیفیت کا اظہار و اقرار بھی نماز کے بعد کے کلمات سے کرو۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ' لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ۔

۶۔ اللہ کے مخلص بندے بنو۔ ایک طرف تو دنیا کا کوئی بھی کام ایسا نہ ہو جو بندگی کا کام نہ ہو۔ یہاں تک کہ کھانا' پینا' سونا' ہنسنا' بولنا بھی۔ حضورؐ یہ سارے کام کرتے تھے' آپؐ عبد کامل تھے' آپؐ کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو بندگی کا کام نہ ہو۔ لیکن دوسری طرف جو زیادہ ضروری ہے وہ یہ کہ ہر کام صرف اللہ کے لیے کرو' صرف مرضات اللہ کے لیے اور لوجہ اللہ کرو: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ (البقرہ ۲:۲۰۷۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے) اور اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی (اللیل ۹۲:۲۰۔ وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لیے کام کرتا ہے)' کے زمرے میں شامل ہو۔ اس کے بغیر بڑے سے بڑا دینی کام --- نماز' قرآن' شہادت' انفاق --- بھی دنیاوی کام ہے۔ اس کے ساتھ' چھوٹے سے چھوٹا دینی کام' اور دنیا کا ہر کام' میزان میں وزنی ہے۔ یہ اخلاص حاصل کر لو گے تو کم عمل بھی کفایت کرے گا' دل و زندگی میں اللہ کا رنگ پیدا کرے گا۔ دل میں' زندگی میں' باہمی تعلقات میں' دنیا میں سارے فساد اور بگاڑ کی جڑ اخلاص کا فقدان ہے' خاص طور پر دینی کاموں میں۔

اپنی نیت کو اللہ کے لیے خالص کرنا' اور خالص رکھنے کی کوشش میں لگے رہنا --- یہ مختصر اور آسان نسخہ ہے' خلاصہ ہے' سارے دین کا' اور ساری زندگی کو دین کے مطابق بنانے کا۔ اللہ کو ہر وقت یاد کرنے اور یاد رکھنے کا بھی سب سے موثر نسخہ یہی ہے۔ یہی دائمی اور ہمہ وقتی ذکر ہے۔

۷۔ ہر کام اللہ کے لیے کرنا آسان ہو گا' جب تم ہر وقت یہ یاد رکھو گے کہ یہ کام اللہ کے سامنے

پیش ہو گا' اور اسی صورت میں قبول ہو گا کہ صرف اسی کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ اس کے ساتھ اپنی نگاہ جنت اور جہنم پر بھی رکھو' جس اجر و ثواب یا عذاب و عتاب کا وعدہ کیا گیا ہے' اس کی طلب یا اس سے بچنے پر نگاہ رکھو۔ جنت کا لالچ اور نار جہنم کا خوف' یہ دو چیزیں بندگی کی راہ پر تمھارے دو مضبوط بازو ثابت ہوں گے: يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (السجدہ ۳۲:۱۶۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں)۔ اسی لیے حضورؐ بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے کہ لالچ اور خوف سے طبیعتوں کو بندگی کے لیے تیار کر دیں۔

۸۔ اللہ کی یاد کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔ ہر طرح اس کا اہتمام کرو۔ ہر وقت کرو: صبح و شام' رات دن کرو۔ ہر حالت میں کرو: کھڑے' بیٹھے' لیٹے کرو۔ اللہ کی یاد سے ہی دل کی طمانیت کا سامان کرو' اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

۹۔ یاد رکھو کہ وہ ہر وقت تمھارے ساتھ ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تم دو ہو' تو تیسرا وہ ہے' جو سب کچھ دیکھ رہا ہے' سن رہا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں جو کچھ ہے وہ بھی جانتا ہے۔ کل کیا ہو گا یہ بھی اس کے علم میں ہے' اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

۱۰۔ یاد رکھو کہ اس کائنات میں صرف اس کا حکم چلتا ہے' اور کسی کا نہیں۔ ہر چیز اسی کی ملکیت ہے' اس کی تابع ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے' کوئی چیز' کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (یٰسٓ ۳۶:۸۲۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے)۔

(دوسری اور آخری قسط آیندہ ماہ ملاحظہ فرمایئے)

پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟

اور (مویشیوں) میں ان کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں
مگر وہ شکر نہیں کرتے!

شکر کرو تو --- اللہ کا وعدہ ہے کہ
ضرور بالضرور خوب زیادہ نعمتوں سے نوازے گا!

نعمتیں بھی کیسی کیسی اور کتنی کتنی'

شمار کرو تو نہ کر سکو
--- لیکن' ایک دن ہر نعمت کے بارے میں ضرور سوال کیا جائے گا!

پھر شکر کیوں نہ کریں؟

زبان شکر سے ضرور تر رہے' لیکن صرف یہ کافی نہیں
شکر یہ ہے کہ نعمت' دینے والے کی رضا کے خلاف استعمال نہ ہو
نعمتوں کو خیال میں لاتے جاؤ --- اور دیکھتے جاؤ
رضا کے خلاف استعمال ہی کفران نعمت ہے'

کافر نعمت نہ بنو' شکر گزار بندے بنو'

شکر کو زندگی کا طریقہ اور رویہ بنا لو!

فرمایا اللہ کے رسولؐ نے : افلا اکن عبدا شکورا

(خیر خواہ)

حجاب کے اندر

خولہ لکاتا

ترجمہ: عبدالجلیل

۱۹۹۱ء کے اوائل میں جب میں نے فرانس میں اسلام قبول کیا تو اسکول میں حجاب کا استعمال گرماگرم بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ فرانسیسی معاشی مسائل سے دوچار تھے جس کے نتیجے میں بے روزگاری عام ہوئی۔ بے روزگاری کے اسباب میں سے ایک سبب مسلم ممالک سے آنے والے تارکین وطن کو سمجھا گیا۔ اپنے شہروں اور اسکولوں میں حجاب کو دیکھ کر ان کے اندر زبردست منفی رجحانات پیدا ہوئے۔ عوام کی اکثریت کا خیال تھا کہ پبلک ایجوکیشنل سسٹم میں حجاب استعمال کرنے کی اجازت دینا سیکولرازم کے خلاف ہے۔ میں اس وقت تک مسلمان نہ ہوئی تھی اس لیے یہ نہ سمجھ سکی کہ اگر کوئی طالبہ اپنے سر پر صرف کپڑا ڈال لیتی ہے تو اسکول اس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ میں یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ مسلمانوں کے نزدیک حجاب استعمال کرنے کی اہمیت کیا ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ عقائد اور مذہبی معاملات کی ادائیگی کے سلسلے میں اسکولوں کو غیر جانب دار رہنا چاہیے اور انھیں ان معاملات میں اس وقت تک دخل نہیں دینا چاہیے جب تک اس سے اسکول کا ڈسپلن خراب نہ ہو۔ (حجاب استعمال کرنے کی وجہ سے کچھ مسلم لڑکیوں کا فرانسیسی اسکولوں سے اخراج بھی ہو گیا تھا)۔

فرانسیسیوں کو دوسرے اہل مغرب کی طرح یہ توقع تھی کہ تاریخ میں حجاب کا نام مغربیت اور سیکولرازم کے غلبے کے زیر اثر ختم ہو جائے گا لیکن عالم اسلام میں خاص طور سے نوجوان نسل کے اندر مختلف ممالک میں پردے کی طرف مراجعت کی ایک زبردست لہر پھیل رہی ہے۔ یہ موجودہ بیداری یا اسلامی احیا کا اظہار ہے۔ چوں کہ مسلمانوں کی عظمت اور تشخص کو نوآبادیاتی نظام اور معاشی استحصال کے ذریعے متعدد بار برباد کیا جا چکا ہے، اس لیے یہ عمل ان کی عظمت رفتہ کے دوبارہ حصول کی ایک علامت بن گیا ہے۔

میرا تعلق جاپان سے ہے۔ تاریخی اعتبار سے مغربی ثقافت کا تجربہ ہم نے پہلی بار میجی دور میں، ۱۸۶۰ کے عشرے میں کیا۔ جب جاپان دوسرے ممالک کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ اس دور میں جاپانیوں کے اندر

مغربی طرز زندگی اور لباس کے خلاف شدید رد عمل ہوا۔ اسی طرح ہم لوگوں کا عربوں نیز دوسرے مسلمانوں کی حمایت کا سبب قدیم روایت پسندی یا مغربیت کی مخالفت میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس کا خود جاپانیوں کو تجربہ ہے۔ انسان کے اندر قدامت پسندی کا میلان جھلکتا ہے' لہٰذا وہ غیر شعوری طور پر نئے اور غیر مانوس طرز حیات کو قبول کرنے کے بجائے شدید رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کبھی یہ جاننے اور سمجھنے کے لیے نہیں رکتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔

ایسا ہی ان غیر مسلموں کا معاملہ ہے جو حجاب کو ظلم کی ایک علامت سمجھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ مسلم عورتوں کو رسم و رواج کا پابند بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی قابل افسوس حالت سے ناواقف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم عورت کی نجات تحریک آزادئ نسواں یا کسی ایسی اقتصادی و معاشرتی اصلاح کے ذریعے ہو گی جو اس کو آزادی دے' اس کے ذہن کو بیدار کرے اور اسے رسم و رواج نیز حجاب کی پابندیوں سے آزاد کرے۔

اس طرز فکر کو عام طور سے ان سب لوگوں نے اپنایا ہے جنھیں اسلام کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ سیکولرازم کے حامی غیر مسلم عام طور پر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کوئی شخص ان کی زندگی کے رخ کو بدل کر اس مذہب کے مطابق کیوں کرنا چاہتا ہے جو صدیوں پہلے رائج ہوا تھا۔ وہ اسلام کی قوت اور اپیل کو نہیں سمجھتے ہیں جو عالم گیر اور لازوال ہے۔ وہ اس حقیقت سے پریشان ہیں کہ دنیا کی مختلف قومیتوں میں ان عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو اسلام کی طرف راغب ہو رہی ہیں اور اپنے آپ کو مستور کر رہی ہیں۔ اس "انوکھی شے" سے انھیں پریشانی لاحق ہے۔ یہ انوکھی شے جو صرف عورت کے گیسو ہی کو پوشیدہ نہیں رکھتی بلکہ اس مخصوص روح نسوانیت کو بھی پوشیدہ رکھتی ہے جس تک ان کی نظروں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ کوئی غیر مسلم باہر سے موثر طور پر یہ نہیں دیکھ سکتا کہ حجاب کی اندر کیا ہے اور نہ ہی میں ایسا مشاہدہ کر سکتی ہوں۔ اس موضوع سے متعلق بہت سی کتابوں کا انداز بھی سرسری اور خارجی جائزے کا ہے۔ ان کے مصنفین کے حاشیہ خیال میں بھی وہ حقیقت نہیں آ سکتی جو ایک عورت کی نگاہ' حجاب کے اندر سے بھانپتی ہے۔ ۱۹۹۱ میں مسلمان ہونے کے بعد ہی میرے تصورات اس سلسلے میں واضح ہوئے۔

ان ایام میں جب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں اسلام قبول کروں یا نہ کروں' میں نے اپنے اندر سنجیدگی کے ساتھ روزانہ پانچ مطلوبہ عبادات ادا کرنے کی صلاحیت اور رجحان کا اندازہ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی حجاب پہننے کے بارے میں سوچا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس بات سے خائف تھی کہ میرے مسلمان ہونے کے فیصلہ پر اثرانداز ہونے کے لیے میرے اندر منفی رجحان نہ پیدا ہو جائے۔ پیرس کی مسجد میں پہلی بار جانے سے قبل میں ایک ایسی دنیا میں رہتی تھی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نماز اور حجاب سے یکسر

ناواقف تھی۔ میں بمشکل یہ تصور کر سکتی تھی کہ میں کبھی ان فرائض کو ادا کر سکتی ہوں یا ان طریقوں کو اپنا سکتی ہوں۔ پھر بھی میرے اندر کوئی چیز رونما ہو چکی تھی اور اسلامی برادری میں داخل ہونے کی میری خواہش اتنی شدید تھی کہ میں اس بات سے قطعاً پریشان نہ تھی جس سے مذہب تبدیل کرنے کے بعد میرا سابقہ ہوتا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت سے اسلام کے لیے ہدایت نصیب ہوئی تھی۔

پہلا مرحلہ

اگرچہ میں حجاب کی عادی نہ تھی لیکن اپنا مذہب تبدیل کرنے کے بعد میں فوراً ہی اس کا فائدہ محسوس کرنے لگی۔ مسجد میں اتوار کے اسلامی لیکچر میں پہلی مرتبہ شامل ہونے کے چند دن بعد اگلے اتوار کو پہننے کے لیے میں نے اسکارف خریدا۔ مجھ سے کسی نے اسکارف پہننے کو نہیں کہا تھا۔ میں مسجد اور وہاں کی دوسری مسلم بہنوں کے احترام میں ایسا کرنا چاہتی تھی۔ میں اتوار کی آمد کے لیے بے قرار تھی' کیونکہ گذشتہ لیکچر نے مجھے ایک ایسے روحانی جذبے سے سرشار کیا تھا جس کا اس سے قبل مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ میرے دل میں روحانیت کے لیے اتنی اشتہا تھی کہ میں نے لیکچر کے ہر لفظ کو اس طرح جذب کر لیا جیسے خشک اسفنج پانی کو جذب کرتا ہے۔ دوسرے اتوار کو لیکچر روم میں جانے سے قبل میں نے وضو کیا اور اسکارف پہنا۔ لیکچر کے بعد میں پہلی بار نماز والے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے دوسری بہنوں کے ساتھ نہایت خاموشی سے نماز ادا کی۔ مسجد میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں نے مجھے اتنا مسرور اور مطمئن کر دیا تھا کہ وہاں سے نکلنے کے بعد بھی اس مسرت کو اپنے دل میں محفوظ کرنے کے لیے میں اسکارف پہنے رہی۔ چونکہ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ اس لیے لوگوں کو میرا اسکارف اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا۔ عوام میں یہ میرا حجاب کا پہلا مظاہرہ تھا اور مجھے اپنے اندر ایک فرق کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو پاکیزہ اور محفوظ سمجھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہو گئی ہوں۔

دوسرے ملک میں ایک جاپانی عورت ہونے کی وجہ سے لوگ مجھے پبلک مقامات پر گھور کر دیکھتے تھے تو میں مضطرب ہو جاتی تھی۔ اب میں اپنے آپ کو حجاب کی وجہ سے محفوظ سمجھتی تھی اور اپنے آپ کو غیر شائستہ نگاہوں کا مرکز نہیں سمجھتی تھی۔

اس کے بعد میں جب بھی باہر گئی تو حجاب میں گئی۔ یہ ایک ایسا بے ساختہ اور رضاکارانہ عمل تھا جس کو کسی نے مجھ پر جبراً نہیں لادا تھا۔ اسلام سے متعلق پہلی کتاب جس کا میں نے مطالعہ کیا' اس میں "حجاب" کو معتدل انداز میں واضح کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "اللہ تعالیٰ اس کی پرزور نصیحت کرتا ہے"۔ اگر کسی نے تحکمانہ لہجے میں کہا ہوتا کہ "جیسے ہی تم اسلام قبول کرو تو تم حجاب ضرور استعمال کرو" تو میں اس حکم کے خلاف ضرور بغاوت کر دینا چاہتی۔ اسلام کا مطلب ہے اللہ کی مرضی کے لیے سپردگی اور اس کے احکام کی

اطاعت کے لیے سر تسلیم خم کرنا۔ مجھ جیسی ہستی کے لیے جس نے برسوں بغیر کسی مذہب کے زندگی گزاری تھی کسی حکم کی بلاشرط تعمیل کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احکامات بغیر کسی غلطی کے ہیں اور صحیح اسلامی طریقہ انھیں بلاچون و چرا تسلیم کرنا اور نافذ کرنا ہے۔ یہ صرف انسانی فہم و ادراک ہے جس سے غلطی کا ارتکاب ہوتا ہے۔ میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اپنی قوت استدلال پر اعتماد رکھتی تھی اور کسی حاکم اعلیٰ کے وجود یا ضابطہ اخلاق کی ضرورت سے متعلق مسلسل سوالات کیا کرتی تھی۔ بہرکیف میری زندگی کے اس موڑ پر میری خواہشات بے ساختہ طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو گئیں۔ الحمدللہ میں اسلامی فرائض کو بلا کسی جبر کے احساس کے ادا کرنے کے لائق ہو گئی تھی۔

میں اپنے نئے خول میں مطمئن تھی۔ یہ صرف اللہ کی اطاعت کی ہی علامت نہیں تھا بلکہ میرے عقیدے کا برملا اظہار بھی تھا۔ ایک حجاب پہننے والی مسلمان عورت جم غفیر میں بھی قابل شناخت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کسی غیر مسلم کا عقیدہ اکثر الفاظ کے ذریعے بیان کرنے پر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ حجاب کے بعد مجھے ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ میرے عقیدے کا واضح اظہار ہے۔ یہ دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے وجود کی یاد دہانی ہے اور میرے لیے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے اور سپرد کرنے کی یاد دہانی۔ میرا حجاب مجھے مستعد اور آمادہ کرتا ہے کہ "ہوشیار ہو جاؤ" تمھارا طرز عمل ایک مسلم کی طرح ہونا چاہیے۔ جس طرح پولیس کا ایک سپاہی اپنی وردی میں اپنے پیشے کا لحاظ رکھتا ہے' اسی طرح میرا حجاب بھی میری مسلم شناخت کو تقویت دیتا ہے۔

دوسرا مرحلہ

اپنا مذہب تبدیل کرنے کے دو ہفتے بعد میں اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے جاپان واپس ہوئی۔ اسلام قبول کرتے ہی میں نے وہ شے دریافت کر لی تھی جس کی مجھے تلاش تھی اور اب میری فرانسیسی ادب میں ڈاکٹریٹ کے حصول میں مزید دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کے بجائے میرے جذبات عربی اور قرآن سیکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ اس لیے میں نے تہیہ کر لیا کہ فرانس واپس نہ جاؤں گی۔

ایک چھوٹے سے جاپانی قصبے میں رہنا یقیناً ایک آزمائش تھی۔ میں نے ماضی قریب ہی میں مذہب تبدیل کیا تھا۔ اسلام سے متعلق میری معلومات بھی کم تھیں' دوسرے مسلمانوں سے مکمل طور پر علیحدہ بھی تھی۔ تاہم اس علیحدگی نے میری اسلامی معلومات کو وسیع کر دیا۔ روزانہ پنجگانہ نماز کی ادائگی اور اسکارف کے استعمال نے میری اسلامی شناخت کو مستحکم کرنے میں معاونت کی اور میرے تعلق باللہ کو تقویت دی۔ میں تنہائی میں اکثر اللہ سے اپنا تعلق استوار کرتی تھی۔

میں جس طرز کا لباس زیب تن کرتی تھی' اب اس میں پہلی بار بڑی تبدیلی ہوئی۔ اسلام عورتوں کو

پبلک میں اپنے جسم کی ساخت کی نمائش سے منع کرتا ہے۔ اس لیے مجھے اپنے بہت سے کپڑوں کو ترک کرنا پڑا جو میری جسمانی ساخت کو پرکشش بناتے تھے۔ منی اسکرٹ' پینٹ' ہاف پینٹ اور چھوٹی آستین کے بلاؤز حجاب سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے میں نے اپنے لیے پاکستانی طرز کی شلوار اور خواتین کے پہننے کی ڈھیلی ڈھالی "کرتی" یعنی جمپر بنوایا۔ جب لوگ میرے نئے انوکھے فیشن کو گھور کر دیکھتے تھے تو اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

تیسرا مرحلہ

مذہب تبدیل کرنے کے چھ ماہ بعد میں نے مصر کا سفر کیا۔ میں نے اپنی عربی اور اسلام کے مطالعے کی شدید خواہش کی تکمیل کسی مسلم ملک میں کرنے کا عزم مصمم کیا تھا۔ میں' مصر میں صرف ایک جاپانی شخص کو جانتی تھی' میرے میزبان کے گھر میں کوئی انگریزی نہیں بولتا تھا۔ میں اپنے میزبان کو پہلی نظر میں دیکھ کر سخت متحیر ہوئی۔ وہ سر سے پاؤں تک بشمول چہرہ سیاہ لباس میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اس سے قبل میں نے فرانس میں ایک عورت کو چہرے کے نقاب کے ساتھ سیاہ لباس میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک بڑی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ وہاں ان مسلم عورتوں کے درمیان جو رنگین لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں اور اسکارف پہنے ہوئے تھیں' اس کی موجودگی بڑی انوکھی معلوم ہوئی۔ میں نے پھر غور کرنا شروع کیا "یہ ایک ایسی عورت ہے جو عرب رسم و رواج کے بندھن میں جکڑی ہوئی ہے اور اسلام کی اصل تعلیم سے نابلد ہے"۔ اس وقت میری اسلامی معلومات بہت محدود تھیں۔ میرا اعتقاد تھا کہ چہرہ ڈھکنے کی جڑیں نسلی رسم و رواج سے منسلک ہیں جس کی اسلام میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ایسا ہی خیال میرے اندر اس وقت پیدا ہوا جب یہ جاپانی عورت مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ "آپ غلو سے کام لے رہی ہیں۔ یہ غیر فطری ہے"۔ مردوں سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھنے کی اس کی کوششیں بھی خلاف معمول دکھائی دیں۔

جلد ہی اس بہن نے مجھے بتایا کہ میرے کپڑے پبلک میں استعمال کرنے کے لیے موزوں نہیں ہیں' اگرچہ میرا یقین تھا کہ میری پوشاک اسلامی پوشش کے مطالبات کے موافق تھی۔ میرے اندر حالات سے مطابقت کرنے کی کافی صلاحیت تھی۔ مشہور مقولہ ہے کہ "جب روم میں رہو تو وہی کرو جو رومی کرتے ہیں"۔ میں نے ایک سیاہ لباس اور ایک لمبا سیاہ سرپوش جس کو دوپٹا کہا جاتا ہے' بنایا۔ اس طرح میں چہرے کے علاوہ مکمل طور پر ڈھک گئی۔ میں نے نقاب کے متعلق بھی سوچا۔ فضا کے مستقل گرد و غبار سے محفوظ رہنے کے لیے یہ ایک عمدہ شے لگی۔ لیکن میری میزبان بہن نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے یہ سوچ کر کہا ہو کہ میں جاپان میں اس پر عمل نہ کر سکوں گی یا میرا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ان بہنوں کا یقین محکم تھا کہ چہرہ چھپانا ان کے مذہبی فرائض کا ایک جزو ہے۔

زیادہ تر بہنیں جن سے میں متعارف ہوئی' نقاب استعمال کرتی تھیں۔ بہرکیف قاہرہ جیسے بڑے شہر میں ان کی تعداد کم تھی۔ بعض کو تکلیف ہوئی اور میرا کالا دوپٹا دیکھنے کے باوجود بھی گلے ملیں۔ عموماً مغرب زدہ مصری مرد برقع پوش عورتوں سے دور رہتے تھے اور انھیں "الاخوات" کہہ کر پکارتے تھے۔ لوگ ان کے ساتھ خصوصی احترام اور نرمی کا رویہ رکھتے تھے۔ یہ بہنیں خاص حد کے اندر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عموماً برقع پوش خواتین اپنے عقیدے کی زیادہ پابند تھیں۔ اسکارف کا استعمال بہت کم یا بالکل نہ کرنے والی اپنے فرائض کی ادائگی سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتی تھیں۔

قبول اسلام سے قبل میں چست پینٹ اور منی اسکرٹ زیب تن کرتی تھی۔ لیکن اب میری لمبی پوشاک نے مجھے بہت مسرور کیا اور میں نے سمجھا کہ میں ایک شہزادی کی طرح ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے اس کو زیادہ آرام دہ پایا۔ میں نے سیاہ پوشش کو ناپسند نہیں کیا۔ اس کے برعکس میں نے قاہرہ جیسے غبار آلود شہر میں اپنی کالی پوشاک کو زیادہ موزوں پایا۔ میری مسلم بہنیں اپنی سیاہ پوشاک اور دوپٹے میں بڑی دلکش لگتی تھیں اور جب اپنے چہروں سے نقاب اٹھاتی تھیں تو اندرونی نور نمایاں ہوتا تھا۔

میں قاہرہ میں اپنے قیام کے دوران سیاہ برقعے میں بہت خوش تھی۔ میرے اندر اس وقت منفی ردعمل ہوتا تھا جب میری مصری بہنیں مجھے مشورہ دیتیں کہ جب میں جاپان واپس جاؤں تو وہاں بھی اسی طرح رہوں۔ مجھے اس بات پر خفگی اور ندامت ہوئی کہ اس وقت جو میں سوچتی تھی وہ نادانی تھی۔ میری دانست میں اسلام عورتوں کو سترپوشی کی اور شخصیت کو پوشیدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس حکم کی تعمیل میں کوئی عورت برقعے کا جو طرز پسند کرے' استعمال کر سکتی ہے' مگر یہ نہ تو بہت باریک اور چست ہو اور نہ ہی زیب و زینت والا۔

ہر سماج کا اپنا ایک فیشن ہوتا ہے۔ میرا تصور تھا کہ اگر میں جاپان کی گلیوں میں لمبی سیاہ پوشاک زیب تن کر کے منظرعام پر آؤں تو مجھے پاگل سمجھا جائے گا۔ میں نے اپنی مصری بہن سے مباحثہ کرتے ہوئے کہا میری نئی پوشاک سے جاپانیوں کو گہرا صدمہ ہو گا اور کوئی میری بات نہیں سنے گا۔ وہ اسلام کو صرف اس کے ظاہر ہی سے رد کر دیں گے اور اس کی تعلیمات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

بہرحال مصر میں اپنے قیام کے اختتام تک میں اپنے لمبے لباس کی عادی ہو گئی تھی اور اسے جاپان میں بھی پہننے کا خیال تھا۔ مجھے اپنے ملک میں سیاہ لباس زیب تن کرنے میں اب بھی تکلف تھا' اس لیے میں نے کچھ ہلکے رنگ کے لباس اور دوپٹے بنائے۔ اس طرز کی پوشاک زیب تن کیے ہوئے میں ایک بار پھر اپنے وطن واپس ہوئی۔

چوتھا مرحلہ

جاپان میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لیے وہ کبھی نظر نہیں آتے۔ تاہم میرے سفید دوپٹے کے ساتھ جاپانیوں کا رویہ ہمت افزا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں ناپسندیدگی اور تضحیک کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لوگوں نے مان لیا تھا کہ میرا تعلق کسی مذہب سے ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کس سے؟ میں نے ایک لڑکی کو اپنی سہیلی سے دھیرے سے یہ کہتے سنا کہ میں بدھ مذہب کی راہبہ ہوں۔ دراصل اسلام قبول کرنے سے بہت پہلے میرے اندر ایک راہبہ کی زندگی گزارنے کی زبردست خواہش تھی۔ یہ بڑا دلچسپ پہلو ہے کہ ایک مسلم اور ایک عیسائی یا بدھ راہبہ کی خارجی ہیئت میں بڑی حد تک مشابہت ہے۔ ایک بار میں پیرس کے سفر میں ایک کیتھولک راہبہ کے ساتھ کار پر سفر کر رہی تھی۔ ہم میں اتنی مشابہت تھی کہ میں بمشکل اپنے تبسم کو روک سکی۔ کیتھولک راہبہ کا لباس اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کر دینے کی علامت ہوتا ہے اور اس کا احترام کیا جاتا ہے اور یہی اس کی پہچان بھی ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے مسلم عورت کا حجاب بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کا مظہر ہوتا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ ایک راہبہ کے لباس کا تو احترام کرتے ہیں اور مسلمان کے حجاب کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور اسے ایک علامت کے بجائے انتہاپسندی اور مظلومیت کا مظہر گردانتے ہیں۔

ایک بار ٹرین میں ایک بزرگ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کیوں یہ نرالے طرز کا لباس پہنتی ہوں؟ میں نے وضاحت کی کہ میں مسلمان ہوں اور عورتوں سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ غیر مردوں سے اپنا جسم پوشیدہ رکھیں، کیوں کہ دل کشی اور حسن کا نامناسب اظہار مردوں کو خوامخواہ آزمایش میں ڈالتا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک شخص ہمیشہ عورتوں کی طرف جنسی جذبے کے تحت نہیں دیکھتا۔ یہ صحیح ہے، لیکن مسئلہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جو ایسا کرتے ہیں۔ ان غیر معمولی جنسی زیادتیوں اور جرائم پر غور کیجیے جو بہت سے معاشروں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہم ان حادثوں کو، مردوں کو محض اعلیٰ اخلاق اور ضبط نفس کی تلقین کر کے نہیں روک سکتے۔ اس کا حل صرف اسلامی طرز حیات ہی میں مضمر ہے جو عورتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پردے میں رکھیں اور مردوں سے تعلق رکھنے سے ممکنہ حد تک اجتناب کریں۔ منی اسکرٹ کا مطلب ہوتا ہے کہ "اگر آپ کو میری ضرورت ہے تو مجھے لے جا سکتے ہیں"۔ حجاب صاف طور پر یہ بتاتا ہے کہ "میں آپ کے لیے ممنوع ہوں"۔ بزرگ اس وضاحت سے کافی متاثر دکھائی دیے۔ شاید اس لیے کہ وہ آج کل کی عورتوں کے ہیجان انگیز فیشن کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹرین سے یہ کہتے ہوئے اتر گئے کہ کاش ہمارے پاس اسلام سے متعلق گفتگو کرنے کے لیے مزید وقت ہوتا۔ جاپانی لوگ عموماً مذہبی گفتگو کے عادی نہیں، تاہم میرے حجاب نے اسلام پر گفتگو کرنے کا دروازہ کھول دیا۔

میرے گھر میں صرف میرے والد کو میرے متعلق زیادہ تشویش تھی کیونکہ میں مکمل پردے میں رہتی تھی۔ گرم ترین دن میں بھی۔ موسم گرما میں ہر شخص گرم ہو جاتا ہے لیکن میں نے حجاب کو اپنے سر اور گردن پر براہ راست سورج کی کرنوں سے بچنے کا موزوں ذریعہ پایا۔ شاید میرے عزیز و اقارب میرے قریب رہنے کو اپنے لیے غیر موزوں سمجھتے تھے۔ تاہم میں اپنی چھوٹی بہن..... جو نیکر پہنے ہوئے تھی..... کی ران دیکھ کر مضطرب ہو گئی۔ اپنا مذہب تبدیل کرنے سے پہلے بھی کسی عورت کے جسم کی ساخت کا منظر جو اس کی جلد سے چپکے ہوئے باریک لباس سے جھلکتا تھا' مجھے پریشان کر دیتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے کوئی ایسی شے دیکھ لی ہے جس کو مجھے دیکھنا نہیں چاہیے تھا۔ اگر یہ بات ایک عورت کو پریشان کر سکتی ہے' تو مردوں کو کتنا متاثر کرتی ہو گی' اس کا تصور مشکل نہیں ہے۔

کچھ عورتیں صرف اس وقت عمدہ پوشاک زیب تن کرتی ہیں جب وہ گھروں سے باہر جاتی ہیں اور انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ گھروں کے اندر کس طرح رہتی ہیں۔ لیکن اسلام میں عورت اپنے شوہر کے لیے دلکش ہونے کی کوشش کرتی ہے اور شوہر بھی اپنی بیوی کے لیے پرشکوہ دکھائی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دوسرے کے متعلق اس طرح کے جذبات ازدواجی زندگی کو پرلطف اور پرمسرت بناتے ہیں۔ کوئی عورت کسی مرد کی توجہ کیوں اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی ہے جب کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ کیا وہ اس بات کو پسند کرتی ہے کہ دوسری عورتیں اس کے شوہر کو اپنی طرف مائل کریں؟ اس طرح کوئی بھی شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ اسلام خاندان کے استحکام میں کس طرح معاونت کرتا ہے۔

صرف عورتوں کو ہی اپنے جسم پوشیدہ رکھنے کے احکام صادر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ مردوں کو بھی اپنی نظریں نیچی رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کھیل کود کے دوران بھی مردوں کے لیے ناف سے گھٹنوں تک اپنے جسم کے حصوں کو پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔

غیر مسلم یہ سوچ سکتے ہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو کپڑوں میں پوشیدہ رکھنے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ ہی حساس ہیں۔ وہ پوچھ سکتے ہیں "جسم کی فطری حالت کو کیوں پوشیدہ رکھا جائے؟" کچھ لوگ تیراکی کا عریاں لباس پہن کر تیرنے یا ننگوں کے کلب میں شامل ہونے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ پھر بھی پچاس سال قبل جاپان میں تیراکی کے لباس میں تیرنا لفنگا پن سمجھا جاتا تھا اور عہد وسطیٰ میں مجاہد (نائٹ) اپنی محبوب و محترم بیوی کے جوتے کی ہلکی سی جھلک ہی دیکھ کر کانپ اٹھتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسم کو پوشیدہ رکھنے کا معاشرے کا معیار تبدیل ہو چکا ہے۔ اگر آپ کسی شے کو پوشیدہ رکھیں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ عورتوں کے جسم کو پوشیدہ رکھنے سے اس کی جاذبیت اور دلکشی بڑھ جاتی ہے' جیسا کہ دنیا کی بیشتر ثقافتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اخلاقی قدریں زمانے سے متاثر ہو سکتی ہیں تو یہ تصور ناممکن نہیں ہے کہ

مستقبل میں لوگ گلیوں میں بغیر کپڑوں کے عریاں گھومیں گے۔ اسے کوئی شے نہیں روک سکتی۔ ہم مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے لیے معیار متعین کر دیا ہے؟ ہم اس کی اتباع کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہی ہمارا خالق ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا چیز سب سے عمدہ اور بہتر ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ انسانی تہذیب کا آغاز اس وقت ہوا جب اس کے اندر شرم کا احساس ابھرا۔ اگر ایک انسان اپنی جسمانی خواہشات اور وظائف کی تکمیل چاہتا ہے اور ایسا کھلے عام کرتا ہے تو وہ جانور سے مختلف نہیں ہے۔ کیا یہی واحد راستہ ہے جس پر انسان سرپٹ چلا جا رہا ہے؟ سوال یہ ہے کہ مناسب لباس اور اخلاق کا تعین کون کرے گا؟..... خود انسان (جس کا معیار قدر ہوا کے رخ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے) یا اللہ تعالیٰ؟ وہ اللہ ہی ہے جو انسان کے ہر زمانے کے حالات سے باخبر ہے' اسی لیے اس نے عوام میں ظاہر ہونے اور عمل کرنے کے صحیح طریقے کو واضح کر دیا ہے۔

پانچواں مرحلہ

جاپان واپس آنے کے تین ماہ بعد میں اپنے شوہر (ایک جاپانی مسلمان سے' جو قاہرہ میں زیر تعلیم تھے' میں نے اپنے مصر کے قیام کے آخری ایام میں شادی کر لی تھی) کے ساتھ سعودی عرب گئی جہاں انھیں ملازمت مل گئی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کو چھپانے کے لیے ایک چھوٹا سا سیاہ کپڑا بنا لیا تھا جس کو نقاب کہا جاتا ہے۔ یہ میں نے اس لیے نہیں بنایا تھا کہ میں نے اپنی قاہرہ والی بہن کے طرز پر سوچنا شروع کر دیا تھا مثلاً یہ کہ پردہ ایک مسلمان عورت کے مطلوبہ لباس کا ایک جزو ہے جب کہ میرا خیال تھا کہ چہرہ اور ہتھیلی کھلا رکھنے کی اجازت تھی' تاہم مجھے سعودی عرب جانے اور چہرے پر نقاب ڈالنے کی شدید خواہش تھی۔ مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق و تجسس تھا کہ نقاب کے اندر سے مجھے کیسا لگے گا!

ریاض پہنچنے کے بعد میں نے دیکھا کہ سب ہی عورتیں چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی تھیں۔ غیر مسلم عورتیں اپنے سروں کو ڈھکے بغیر لاپرواہی کے ساتھ اپنے شانوں پر سیاہ عبا ڈالے رہتی تھیں۔ بہت سی غیر ملکی مسلم عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ پھر بھی تمام سعودی عورتیں سر سے پاؤں تک مکمل طور پر پردے میں رہتی تھیں۔

پہلے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مسلم بہنیں' برقعے کے اندر کیسے آسانی سے سانس لے سکتی ہیں۔ اس کا انحصار عادت پر ہے۔ جب کوئی عورت اس کی عادی ہو جاتی ہے تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ پہلی بار میں نے نقاب لگایا تو مجھے بڑا عمدہ لگا۔ انتہائی حیرت انگیز' ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک اہم شخصیت ہوں۔ مجھے ایک ایسے شاہکار کی مالکہ ہونے کا احساس ہوا جو اپنی پوشیدہ مسرتوں سے لطف اندوز ہو' میرے پاس ایک خزانہ تھا جس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا' جسے اجنبیوں کو دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

ریاض میں ابتدائی چند مہینوں تک میری صرف آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ لیکن جب میں نے جاڑے کا برقع بنایا تو اس میں آنکھوں کا باریک نقاب بھی شامل کر لیا۔ اب میرا پردہ مکمل تھا۔ اس سے مجھے یک گونہ آرام ملا۔ اب مجھے بھیڑ میں کوئی پریشانی نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں مردوں کے لیے غیر مرئی ہو گئی ہوں۔ آنکھوں کے پردے سے قبل مجھے اس وقت بڑی پریشانی ہوتی تھی' جب اتفاقیہ طور پر میری نظریں کسی مرد کی نظروں سے ٹکراتی تھیں۔ اس نئے نقاب نے سیاہ عینک کی طرح مجھے اجنبیوں کی گھورتی نگاہوں سے محفوظ کر دیا۔ ایک غیر مسلم کسی داڑھی والے مرد کو کسی ایک سیاہ برقع پوش خاتون کے ساتھ دیکھ کر اس جوڑے کے متعلق ایک ایسے ہیولے کا تصور کر سکتا ہے جو ظالم و مظلوم یا غالب و مغلوب ہو' اسلام میں شوہر و بیوی کا ایسا تعلق ایک صفت سمجھی جاتی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا احترام اور حفاظت ایک ایسے شخص کے ذریعے کی جاتی ہے جو واقعتاً اس کا لحاظ کرتا ہے' یا میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنے کو ایک ایسی شہزادی تصور کرتی ہے جس کا ہم سفر اس کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ کتنا زبردست مغالطہ ہے کہ مسلم عورتیں مردوں کی نجی ملکیت ہیں اور انھوں نے حسد کی بنا پر اس بات سے روک دیا ہے کہ اجنبی مرد انھیں دیکھیں۔ ایک عورت اپنے آپ کو اللہ کے فرمان کی اتباع میں چھپائے رکھتی ہے تاکہ اس کو عظمت و سربلندی حاصل ہو۔ وہ گھورتی ہوئی اجنبی نگاہوں کا ہدف بننے یا اس کی شے ہونے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ مغربی عورتوں کے لیے ہمدردی اور ترحم کا جذبہ رکھتی ہے جنھیں نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مجھے مسلمان ہوئے دو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ میرے ماحول اور مذہبی شعور کے ساتھ ساتھ میرا حجاب پانچ بار تبدیل ہوا۔ فرانس میں اپنا مذہب تبدیل کرنے کے فوراً بعد میں نے ہم رنگ فیشن ایبل لباس اور اسکارف استعمال کیے۔ سعودی عرب میں اب میں سر سے پاؤں تک مکمل سیاہ نقاب میں پوشیدہ ہوں۔ اس لیے مجھے حجاب کے آسان ترین طرز سے مکمل طرز تک کا تجربہ ہے۔

کئی سال قبل جب ایک جاپانی مسلمہ سر پر دوپٹا پہنے ہوئے ٹوکیو کی ایک مسلم تنظیم میں نظر آئی تو جاپانی مسلم عورتوں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے لباس کے معاملے میں دوبارہ غور کرے کیونکہ اس طرز کے لباس سے جاپانیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس وقت جاپان میں کم مسلمان عورتیں اپنے سروں کو چھپاتی تھیں۔ اب زیادہ سے زیادہ جاپانی عورتیں اسلام قبول کر رہی ہیں اور مشکل حالات کے باوجود سروں تک کو چھپا رہی ہیں۔ وہ سب یہ تسلیم کرتی ہیں کہ وہ اپنے حجاب پر نازاں ہیں اور اس سے ان کے ایمان و یقین کو تقویت ملتی ہے۔

باہر سے حجاب کو دیکھ کر کوئی شخص اس کیفیت کا تصور ہی نہیں کر سکتا جس کا اندرون سے مشاہدہ ہوتا

ہے۔ ہم اس معاملے کو دو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک غیر مسلم کو اسلام ایک جیل خانہ کی طرح نظر آتا ہے جس میں کسی طرح کی آزادی نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اسلام میں رہ کر سکون' آزادی اور ایسی مسرت کا احساس ہوتا ہے جس کو کسی اور شکل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جو کسی مسلم گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ اسلام کو سب سے بہتر طرز حیات سمجھتا ہے' کیونکہ وہ اس سے ابتدا ہی سے واقف ہوتا ہے اور باہر کی دنیا کے کسی اور تجربے کے بغیر وہ بڑا ہوتا ہے لیکن میں تو پیدائشی مسلمہ نہیں ہوں' بلکہ میں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے۔ میں نے نام نہاد آزادی اور جدید طرز حیات کی دلفریبیوں اور لذتوں کو خیرباد کہہ کر اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو عورتوں پر ظلم کر رہا ہے؟ تو آج یورپ' امریکہ' جاپان اور دوسرے ممالک میں بہت سی خواتین اسلام کیوں قبول کر رہی ہیں؟ کاش کہ لوگ اس پر روشنی ڈالتے۔

کوئی شخص تعصب کی عینک لگا کر کسی ایسی عورت کی عظمت کا مشاہدہ کرنے کے لائق نہیں ہو سکتا جو حجاب میں پر اعتماد' مطمئن' پر سکون اور باوقار ہو' جس کے چہرے پر مظلومیت کا سایہ تک نہ ہو۔

52

اسلام اور مغرب کے درمیان

پل کی تعمیر

(۱)

مسلم سجاد

مختصر ہوتی ہوئی دنیا میں فاصلے سمٹنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام اور مغرب کچھ زیادہ ہی آمنے سامنے آگئے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغرب شاید اتنا بڑا کا موضوع نہیں ہے جتنا مغرب میں اسلام۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے مسائل کا اتنا شعور نہیں ہے جتنا مغرب کو ہے اور دوسری یہ کہ مغرب میں رسل و رسائل کے ذرائع جس انتہا تک پہنچ گئے ہیں، مسلمان ملک کا ایک راہ چلتا شہری اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں، مضامین اور مذاکرے ہی نہیں، علمی مجالس، جامعات میں تحقیقی مقالے، مغرب کے اپنے اور مسلم ممالک کے وہ تازہ ترین حالات اور تجزیے پیش کرتے ہیں جن کی کوئی جھلک مسلم ممالک کے اپنے ذرائع ابلاغ پر نظر نہیں آتی۔ (الجزائر سی این این کے لیے موضوع ہے، پی ٹی وی کو اس کے لیے فرصت نہیں)۔

تین سال قبل پرنس چارلس نے اسلام اور مغرب کے حوالے سے اسلام کے لیے ایک ہمدردانہ تقریر کی تھی جس کا ترجمہ، ترجمان القرآن میں جنوری ۹۴ کو شائع ہوا۔ عموماً مسلم دنیا میں اس کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن مغرب میں ایسا نہیں ہوا۔ مغرب میں جب اسلام کے لیے کوئی ہمدردانہ تحریر شائع ہو تو آزادی نسواں کی علم بردار خواتین، لبرل عناصر اور عیسائی اپنے اپنے موقف کے مطابق ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں لیکن اکثریت ان کی ہوتی ہے جو مسلمانوں کی کسی عالمی سازش پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کا ایک اظہار ناٹو کے سابق سیکرٹری کا وہ مشہور بیان ہے کہ کمیونزم کے بعد اب اسلام ہمارا عالمی دشمن ہے۔ اس پس منظر میں پرنس چارلس کی یہ کوشش کہ اسلام کو سمجھنے میں تاریخی شعور اور اعتدال کو سامنے رکھا جائے، نہایت

اسلام اور مغرب کے درمیان

پُل کی تعمیر

(۱)

مسلم سجاد

مختصر ہوتی ہوئی دنیا میں فاصلے سمٹنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام اور مغرب کچھ زیادہ ہی آمنے سامنے آگئے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغرب شاید اتنا روز کا موضوع نہیں ہے جتنا مغرب میں اسلام۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے مسائل کا اتنا شعور نہیں ہے جتنا مغرب کو ہے اور دوسری یہ کہ مغرب میں رسل و رسائل کے ذرائع جس انتہا تک پہنچ گئے ہیں، مسلمان ملک کا ایک راہ چلتا شہری اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں، مضامین اور مذاکرے ہی نہیں، علمی مجالس، جامعات میں تحقیقی مقالے، مغرب کے اپنے اور مسلم ممالک کے وہ تازہ ترین حالات اور تجزیے پیش کرتے ہیں جن کی کوئی جھلک مسلم ممالک کے اپنے ذرائع ابلاغ پر نظر نہیں آتی۔ (الجزائر سی این این کے لیے موضوع ہے، پی ٹی وی کو اس کے لیے فرصت نہیں)۔

تین سال قبل پرنس چارلس نے اسلام اور مغرب کے حوالے سے اسلام کے لیے ایک ہمدردانہ تقریر کی تھی جس کا ترجمہ، ترجمان القرآن میں جنوری ۹۴ کو شائع ہوا۔ عموماً مسلم دنیا میں اس کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن مغرب میں ایسا نہیں ہوا۔ مغرب میں جب اسلام کے لیے کوئی ہمدردانہ تحریر شائع ہو تو آزادی نسواں کی علم بردار خواتین، لبرل عناصر اور عیسائی اپنے اپنے موقف کے مطابق ردِعمل ظاہر کرتے ہیں لیکن اکثریت ان کی ہوتی ہے جو مسلمانوں کی کسی عالمی سازش پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کا ایک اظہار ناٹو کے سابق سیکرٹری کا وہ مشہور بیان ہے کہ کمیونزم کے بعد اب اسلام ہمارا عالمی دشمن ہے۔ اس پس منظر میں پرنس چارلس کی یہ کوشش، کہ اسلام کو سمجھنے میں تاریخی شعور اور اعتدال کو سامنے رکھا جائے، نہایت

کیتھرین نے خالص عورتوں والے انداز میں (خواتین سے معذرت کے ساتھ) جلی کٹی سناتے ہوئے کہا: چارلس کو تو واقعی اسلام میں بہت کشش محسوس ہونا چاہیے اس لیے کہ قرآنی تعلیمات پر عمل ہوتا تو ڈیانا کے ساتھ اس کے مسائل یہ شکل اختیار نہ کرتے۔ کسی عقلی دلیل سے پرنس کے لیے کسی امتیازی مقام یا خصوصی اختیارات کا جواز تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اسے مغرب کی روشن خیالی کے مقابلے میں اسلام کی غیر معقولیت میں اپیل محسوس ہوتی ہے۔ پرنس کے لیے موٹر کاریں' اس کا ذاتی جہاز' اس کے پسندیدہ بسکٹ بیک کرنے کی مشینیں--- سب جدید مادیت نے اسے دی ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ ہمیں اسلام کا مطالعہ کرنا چاہیے! پرنس کو آیندہ سال کویت' بحرین' قطر' بنگلہ دیش اور سعودی عرب کے دورے پر جانا ہے' کیتھرین لکھتی ہے کہ پرنس نے شاید کوئی ضمانت حاصل کی ہو گی کہ وہاں اس پر شریعت کا اطلاق نہ ہو اور اسے سنگسار نہ کر دیا جائے۔ (یہاں اس نے زنا کی سزا والی آیت نقل کی ہے کہ پرنس نے ضرور یہ پڑھی ہو گی)۔ وہ کہتی ہے کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس میں ادھر ادھر ہونے کی گنجایش ہو' جو اس کے احکامات نہیں مانے گا وہ سیدھا جہنم میں جائے گا' خواہ عیسائی ہو' یا یہودی--- وہ کہتی ہے کہ اسلام کی تاریخ میں بہت کچھ قابل قدر ہے۔ شرعی قوانین اور مرد و زن کی عدم مساوات کو جانے دیں' تصوف کا حسن' علمی روایت' فلسفہ' طب' ریاضی اور علم نجوم میں ان کی خدمات کا سب اعتراف کرتے ہیں اور اب ایسے مسلمان بھی ہیں جو معقول اور روادار ہیں اور عدم مساوات میں یقین نہیں رکھتے' لیکن یہ کون سا موقع تھا' اسلام کی تعریف کرنے کا!

اس وقت تو طالبان نے افغانستان میں عورتوں کو گھروں میں قید کر دیا ہے' لڑکیوں کو تعلیم سے محروم کر دیا ہے اور شطرنج' موسیقی ہر چیز پر پابندی لگا دی ہے۔ چوروں کے ہاتھ کاٹے جا رہے ہیں۔ شادی کے علاوہ جنسی تعلق قائم کرنے والوں کو سنگسار کیا جا رہا ہے۔ آنکھوں اور پنڈلیوں کو کھلا رکھنے پر عورتوں کو زد و کوب کیا جا رہا ہے۔ الجزائر میں اسلامی مجاہد' اپنی ہم مذہب عورتوں کی عصمت دری کر رہے ہیں۔ سوڈان میں عیسائی بچے اغوا کر کے مسلمان کیے جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ان باتوں کو مذہب کے مہذب پیروکاروں کے عمل سے کنفیوز نہ کیا جائے لیکن اسلام کے تاریک گوشوں میں روشنی کی کرنیں نہیں پہنچ رہی ہیں اور معتدل ممالک بھی بنیاد پرستی کی زد میں ہیں۔ بے نظیر کے پاکستان میں روزانہ ایک عورت چولہا پھٹنے سے ہلاک ہوتی ہے۔ مصر میں عدالت نے پروفیسر اور اس کی بیوی کو طلاق کا حکم دیا کہ اس کی قرآن کی تشریح نے اسے کافر بنا دیا ہے۔ کویت میں ہمارے حلیفوں نے ایک تاجر کو اس لیے سزائے موت دی کہ اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ سعودی عرب میں ایک شامی کو اس لیے قتل کر دیا گیا کہ وہ جادو ٹونا کرتا تھا۔

یقیناً پرنس چارلس کا ملنا جلنا دوسری قسم کے مسلمان رہنماؤں سے ہوگا لیکن یہ کون ہیں۔ کیا ان میں شیخ عمر باقری محمد بھی ہیں جو "حماس" کے حامی ہیں، جو اسلامی ریاست کے لیے احتجاج کرتے ہیں اور جنھوں نے حال ہی میں ہم جنس پرستوں سے کہا ہے کہ بگ بین سے کود کر ہلاک ہو جائیں! یا سعودی عرب کے مخالف ڈاکٹر المسیری جو ہمارے ملک کی دی ہوئی آزادی سے فائدہ اٹھا کر یہودیوں کو نیست و نابود کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ پرنس چارلس اسلام کو اپنی کھلی حمایت دے کر، دراصل کیا چاہتے ہیں؟ کیا انھیں خود بھی معلوم ہے؟ ان کی رعایا کی حیثیت سے ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔

یہ ایک نقطہ نظر کا اظہار ہے۔ یہاں اس لیے پیش کیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی ذرا سی بھی حمایت میں بولنے والے کے کیسے لتے لیے جاتے ہیں اور معتدل عناصر، جو پل تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ کتنا مشکل کام ہے۔

(۲)

پرنس چارلس

ترجمہ : امجد عباسی

خواتین و حضرات! مجھے خوشی ہے کہ آپ آج یہاں ولٹن پارک کی پچاس سالہ تقریب کے موقع پر آئے ہیں۔ یہ پارک عالمی مسائل پر غور و فکر کے حوالے سے ایک اہم ادارہ بن چکا ہے اور اسے دنیا بھر میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں مسائل پر نئے انداز سے غور و فکر کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگ "ولٹن پارک" اس لیے آنا چاہتے ہیں کہ وہ دنیا کے اہم ترین مسائل کا تجزیہ کریں اور ان کا کوئی حل پیش کریں۔

میں نے کافی دیر سوچا کہ روحانیت (sacred) کے احساس اور اسلامی اور مغربی دنیا میں باہمی تفہیم سے اس کے تعلق کو موضوع گفتگو بنایا جائے۔ میں جانتا تھا کہ کچھ لوگوں کے نزدیک، خالص عملی مسائل کے حل کے لیے، یہ کوئی روایتی یا آسان راستہ نہ تھا۔ مگر اس بات سے میری حوصلہ افزائی ہوئی کہ ماضی میں جب کبھی بھی، میں نے ہمت کر کے اس موضوع پر اظہار خیال کیا، حتیٰ کہ انٹرنیشنل فائنانسرز اور پراپرٹی ڈو یلپرز جیسے خشک لوگوں کے درمیان بھی، تو جیسے اس نے دلوں کے تار چھیڑے اور اسے بہت توجہ دی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کے اندر روحانیت کے اس احساس کی بازگشت موجود ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ برا بھلا سننے اور تمسخر اڑائے جانے کے خوف سے اس کا وجود تسلیم کرنے سے ڈرتے ہیں۔ یہ ہنسی اڑنے کا، حتیٰ کہ "اللہ" کا نام لینے کا بھی، خوف، واضح علامت ہے کہ نام نہاد مغربی تہذیب اپنے معنی کھو

چکی ہے۔

میں اپنی بات کی ابتدا اس یقین کے ساتھ کر رہا ہوں کہ اسلامی تہذیب اپنی بہترین حالت میں، مشرق کے دیگر مذاہب، یہودیت، ہندومت، جین مت اور بدھ مت کی طرح، اہل مغرب کے لیے اس حوالے سے نہایت اہم پیغام رکھتی ہے کہ اس کے پاس ہماری اردگرد کی دنیا کی تقدیس کا مربوط اور یکجا تصور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغرب میں ہم، اسلام کی نظام فطرت کے احترام کی روایت کی قدر کر کے، اپنی فکر کی یہ بنیادیں ازسرنو دریافت کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عمل دونوں مذاہب کو قریب کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ اس طرح بھی مددگار ہو سکتا ہے کہ اہل مغرب، حفظان صحت، ماحولیات، زراعت، فنون لطیفہ اور شہری منصوبہ بندی کے میدانوں میں اپنی عملی رہنمائی میں بہتری کے لیے ازسرنو غوروفکر کریں۔ میں نہایت اختصار سے وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

میری عاجزانہ رائے میں، جدید مادیت، غیر متوازن ہے اور طویل المدت نتائج کے اعتبار سے اس کے نقصانات میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب، دنیا کی روحانی اہمیت کا مربوط تصور رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر، عیسائیت میں "تجسیم یسوع" کا باطنی اور علامتی عقیدہ، روح اور مادہ کی دنیاؤں کی وحدت کا اور اس دنیا میں انسانیت کے لیے الوہیت کے اظہار کا پیغام ہے۔

مگر گذشتہ تین صدیوں کے دوران، کم از کم مغرب میں، ہمارے تصور دنیا میں، ایک خطرناک تقسیم در آئی ہے۔ سائنس نے ہماری عقل و فکر پر اجارہ داری بلکہ جابرانہ تسلط حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذہب اور سائنس علیحدہ ہو چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں، جیسا کہ ولیم ورڈز ورتھ نے کہا: "ہم فطرت میں بہت کم کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں جو ہماری ہے"۔ سائنس نے کوشش کی ہے کہ وہ خدا سے نظام فطرت چھین لے۔ اس نے کائنات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ہماری روحانیت کو ہماری فکر کے ایک علیحدہ اور ثانوی خانے میں ڈال دیا ہے جس کا روزمرہ کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

ابھی ہم نے اس نقطہ نظر کے تباہ کن اثرات کا اندازہ کرنا شروع ہی کیا ہے۔ عالم مغرب میں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے ہم، اپنے ماحول کے ایک "کل" ہونے کے احساس اور نوع انسانی کے لیے اپنی بھاری اور مستقل ذمہ داری کے تصور سے عاری ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہم آباد اجداد کی صدیوں کی روایت اور دانش کی قدر کرنے یا اسے سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ یقیناً ان روایات و اقدار کے ساتھ ایک ناروا امتیاز برتا گیا جیسے کہ وہ کوئی ناقابل قبول معاشرتی مرض ہو۔

میری رائے میں، اب ہماری معاصر دنیا میں ایک "کلی سوچ" اپنانے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ سائنس نے ہمیں ایک ایسی دنیا دکھا کر، جو ہمارے ممکنہ تصورات سے بھی بہت زیادہ ہے، غیر معمولی خدمت انجام دی

ہے۔ لیکن یہ اپنی جدید مادہ پرست اور یک رخی شکل میں تمام مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ خدا محض نیوٹن کا پیش کردہ حساب دان یا میکانکی گھڑی ساز نہیں ہے۔ فرانسس بیکن کا کہنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو قائل کرنے کے لیے معجزہ نہیں دکھائے گا جو گھاس کی ایک پتی کے اگنے اور برستی بارش کے معجزے کو نہیں دیکھ سکتے۔ جوں جوں سائنس اور ٹیکنالوجی' اخلاقی اور روحانی اقدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں' اس دوری کے مضمرات زیادہ گھمبیر اور خوفناک ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم مثال کے طور پر' جینیاتی کاریگری میں یا بی۔ایس۔ای کے اسکینڈل میں سائنسی ادعا کے اظہار میں دیکھ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہماری علیحدہ اور غیر مطمئن دنیا میں ان مادیت پسند مزعومات کے خطرے کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رجحان غالباً تبدیل ہونے والا ہے لیکن روایتی "مقدس گائے" کے بڑے بڑے ریوڑ ابھی تک اس راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ کچھ سائنس دانوں کو بتدریج کائنات کی پرجلال اور پراسرار پیچیدگیوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ لیکن اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ دنیا کے عظیم مذاہب نے جسے ہماری داخلی اور بیرونی دنیا اور ہماری جسمانی اور روحانی فطرت کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے' ان کے درمیان ازسرنو رابطے کو تلاش کیا جائے۔ یہ پل' یہ رابطہ' ہماری انسانیت کا اظہار ہے۔ یہ اس کردار کو روایتی علم و فن کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے' جس نے انسانیت کو تہذیب سکھائی ہے اور جس کے بغیر تہذیب و تمدن کو زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ صدیوں کے تغافل اور خشک مزاجی (cynicism) کے بعد' مذہبی اقدار کی مابعد الطبیعیاتی حکمت دوبارہ دریافت کی جا رہی ہے۔ اس میں یہودیت' عیسائیت اور اسلام اور افلاطون کا علم مابعد الطبیعیات جو مغرب کے فلسفے اور روحانی تصورات کے لیے نہایت اہم ہے' سب ہی شامل ہیں۔

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ہماری زندگی میں پائی جانے والی کوئی بھی روایت محض ایک انسانی اختراع نہیں ہے بلکہ خدا کا عطا کردہ ایک ایسا موزوں اور فطری ہم آہنگ بنیادی وجدان ہے جو ان اختلافات سے وجود میں آتا ہے' جس کا مشاہدہ فطرت کے ہر پہلو میں کیا جا سکتا ہے۔ "روایت" نظام کائنات کے دائمی نظم کی عکاس ہے اور ہمیں کائنات کے عظیم رازوں سے آگاہ کر کے' ان سے وابستہ کر دیتی ہے جیسا کہ بلیک نے اس طرف اشارہ کیا ہے: "ہم ایک ایٹم میں پوری کائنات دیکھ سکتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں دوامیت بھی"۔ اسی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ انسان محض ایک حیاتیاتی مظہر نہیں ہے جو زندگی کے میزانیے کی نچلی سطح پر رہ رہا ہے جس کے مطابق آرٹ اور کلچر زندگی کے اختیاری عناصر نظر آتے ہیں۔

یہ ایک مسلمان' ہنرمند یا آرٹسٹ کے نقطہ نظر سے بڑی حد تک متضاد ہے جو اپنی خاطر کسی نمائش میں دلچسپی نہیں رکھتا' نہ اپنی ذات کے لیے آگے بڑھنا چاہتا ہے' بلکہ اپنے شاہکار اللہ کے حضور پیش کر کے

مطمئن رہتا ہے۔ یہ رویہ' میرے خیال میں قرآن کی اس عظیم آیت کی عکاسی کرتا ہے جس کے مطابق:
"جس طرف بھی تم رخ کرو گے' اسی طرف اللہ کا رخ ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔ (البقرہ ۲:۱۱۵)

یہ اصل معصومیت تباہ ہو چکی ہے اور ہر جگہ سے ختم ہو چکی ہے لیکن میں بہرصورت یقین رکھتا ہوں کہ ان تہذیبی اقدار کی بقا کا انحصار جنھیں ہم نے اپنے آباواجداد سے ورثے میں حاصل کیا ہے' ہمارے دلوں میں روحانیت کے گہرے احساس کے زندہ رہنے پر ہی ہے۔

روایتی مذاہب' اپنے کلی تصور کائنات کے ساتھ' دین اور دنیا کے درمیان وحدت کی اہمیت کو از سرنو تلاش کرنے میں ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں جیسا کہ میں نے آکسفورڈ میں ۱۹۹۳ کی اپنی تقریر' "اسلام اور مغرب" میں کہا تھا۔ ہمارے وجود کے اس لازمی پہلو کو نظرانداز کرنا محض روحانی یا علمی حوالے سے ہی خطرے سے خالی نہیں ہے بلکہ یہ زندگی میں مادیت پرستی کے مقام پر اسلام اور مغرب کے مختلف موقف کی اصل اساس بھی ہے۔ اسلام' مغرب کی مادہ پرستی کو مسترد کر دیتا ہے' میری رائے میں' یہ کوئی سیاسی دکھاوا' کسی حسد کا نتیجہ یا کسی احساس کمتری کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ بات بالکل برعکس ہے۔ یہ خدشہ حقیقی نظر آتا ہے کہ اسلام اور دیگر مشرقی مذاہب اور مغرب کے درمیان خلیج اس حد تک بڑھ جائے کہ اسے پاٹا نہ جا سکے' اگر ہم دونوں تہذیبیں مل کر' دینی اور دنیوی کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے عملی اقدامات نہیں اٹھاتے تاکہ آیندہ صدی کے لیے ایک نیا جذبہ بیدار ہو سکے۔

روحانیت کے اس کُلّی تصور کی از سرنو دریافت' عملی سرگرمی کے بہت سے اہم میدانوں میں ہماری معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ میدان طب میں' کچھ سائنس دانوں کی جو بھی رائے ہو' مذہب اور سائنس اور مادی دنیا اور روحانی احساس کے درمیان تعلق کا ٹوٹ جانا' صحت عامہ کے حوالے سے' یک رخ رویے اور شفا کے عمل کے اسرار اور اس کی کلیت کو سمجھنے میں ناکامی کی طرف لے گیا ہے۔ ایسے ہسپتال قائم کیے جانے چاہییں اور انھیں اس طرح ڈیزائن کرنا چاہیے کہ وہ بحالی صحت کے "جامع عمل" کے عکاس ہوں' اگر انھیں بحالی صحت میں زیادہ مکمل کردار ادا کرنا ہے تو---! جدید میڈیسن کا بیماری کے حوالے سے عموماً یک رخا رویہ ہے' اگرچہ اس کی کچھ کامیابیاں کسی معجزے سے کم نہیں ہیں' حالانکہ جو علم حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے ایک نہایت معمولی حصے سے زیادہ تک نہیں پہنچا جا سکا ہے۔ اب روایتی طریقوں کی طرف رجوع سے' مزید آگے بڑھا جا سکتا ہے اور جدید میڈیسن کو مالا مال کیا جا سکتا ہے۔ مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ جدید اور قدیم کے امتزاج کو اختیار کرنے والے روشنی کے کچھ مینار وجود میں آئے ہیں مثلاً "میری لی بون ہیلتھ سنٹر لندن" اور "برسٹل کینسر ہیلپ سنٹر"۔

ہمارا ماحول' ہماری معاشی ترقی کی یک طرفہ سوچ کی وجہ سے ہمارے ڈراؤنے خوابوں سے زیادہ تباہی کا شکار ہے۔ یہ ترقی' ماضی قریب تک' انسانوں کے باہمی رابطے کو وزن نہ دیتی تھی۔ جس توازن کو برقرار رکھ کر قدرت کا پورا نظام چل رہا ہے' اور اس کی جو حدود قائم کی گئی ہیں اور برقرار رکھی جاتی ہیں' ان کی ضرورت اور اہمیت سمجھنے کی بھی بہت کم فکر کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماحول کا تحفظ نسبتاً حالیہ موضوع ہے۔ اگر ہم اپنی زمینوں کی زرخیزی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری آیندہ نسلوں کی غذائی ضروریات فراہم ہو سکیں تو نامیاتی اور برقرار رہنے والی کاشت کاری ناگزیر ہے۔

تیسرا میدان جسے روحانیت اور مادیت کا فرق متاثر کر رہا ہے' فن تعمیر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عمارات ان اصولوں کی روشنی میں تعمیر کی جائیں' جو کائنات سے ہم آہنگی کے عکاس ہوں اور جن میں لوگوں کو سہولت ہو اور ان میں لوگ رہنا بھی چاہیں۔ اسی بنا پر' پانچ سال قبل میں نے اپنے ذاتی ایک چھوٹے سے انسٹی ٹیوٹ آف آرکی ٹیکچر کا آغاز کیا تھا۔ ٹائٹس بخارڈت (Titus Buckhardt) نے لکھا ہے: "یہ فن کی فطرت ہے کہ روح کو خوشی دے' لیکن ہر فن کا روحانی پہلو نہیں ہوتا"۔ یہ روحانی پہلو ہم روایتی عیسائی فن تعمیر میں دیکھتے ہیں۔ یہی پہلو ہم عرب کے اسلامی آرٹ اور فن تعمیر میں بھی پاتے ہیں جو آخری تجزیے میں "الوہی وحدت" کا مظہر ہیں جو دراصل قرآن کا بنیادی پیغام ہے۔ پیغمبر محمدؐ نے خود ایک موقع پر کہا ہے: "اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے"۔

شہری منصوبہ بندی کی طرف بھی نگاہ دوڑانے کی ضرورت ہے۔ مشہور مورخ' ابن خلدون' شہری زندگی اور روحانی سکون کے درمیان گہرے تعلق کو تہذیب و تمدن کی لازمی بنیاد سمجھتا تھا۔ کیا ہم کبھی اپنے شہروں میں اس ہم آہنگی کی طرف پلٹ سکیں گے؟ ابن خلدون لکھتا ہے کہ تہذیبوں کے زوال کے ساتھ' فنون کو بھی زوال آتا ہے۔

اس ساری گفتگو کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ روحانی اقدار کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی جائے۔ یہ جدوجہد' ہماری زندگی کی روحانی قدروں کی اساس کو بحال کرنے اور جدید دنیا نے جس چیز کو ٹکڑے کر دیا ہے' اسے جوڑنے کے لیے ہونی چاہیے۔ اسلامی ثقافت اپنی روایتی شکل میں' روحانی تصور دنیا کو اپنے اندر اس طرح سموئے ہوئے ہے جس طرح ہم نے مغرب کی حالیہ نسلوں میں کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے۔ اس حوالے سے ہم اسلام کے "تصور جہاں" سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے مذاہب کے درمیان جو مشترک اور دائمی قدریں پائی جاتی ہیں' انھیں سمجھنے میں بھی یہ "تصور جہاں" ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارے اسلامی اور مغربی' دونوں جدید معاشرے' اس مشترکہ جدوجہد سے اپنے مذاہب میں زندگی کے متعلق پائے جانے والے ان مشترکہ روایتی تصورات اور ان عظیم ذمہ داریوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں جو ہمیں دنیا کے تحفظ اور قیادت کے

لیے ادا کرنا ہیں۔

۱۹۹۳ میں آکسفورڈ میں اپنی تقریر کے دوران میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ عالم اسلام اور مغرب کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کے لیے زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ اس عمل کی اہمیت کے بارے میں میرا پختہ یقین آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ غفلت اور تعصب برتنے کی وجہ سے دونوں تہذیبوں کو جو نقصان ہو گا وہ ناقابل تلافی ہو گا۔ بہت سے ایسے طریقے ہیں جنھیں اپنا کر باہمی تفہیم اور قدر افزائی کی فضا کو ہموار کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم روحانیت کی بالکل آسان تعبیر سے بھی شروع کریں، جو ہماری دنیا کے ہر پہلو میں رچی بسی ہے، تو اسلامی تہذیب اور مغرب کے درمیان نئے رابطے قائم ہونے کے بڑے امکانات ہیں۔ مثال کے طور پر شاید ہم برطانوی سکولوں میں زیادہ مسلمان اساتذہ کی خدمات سے استفادہ کر کے یا اساتذہ کے باہمی تبادلے سے، اس کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں لوگ انگریزی سیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن مغرب میں، اس کے بجائے ہمیں ضرورت ہے کہ مسلم اساتذہ ہمیں بتائیں کہ دماغ کے ساتھ ساتھ دل سے کیا سیکھا جاتا ہے۔ آنے والی صدی، اس رابطے کو تلاش کرنے اور آگے بڑھانے کے لیے مثالی عمل انگیز ثابت ہو سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم اس موقع کو ضائع نہ کریں گے جو ہمیں ہمارے کل وجود کی روحانی اساس از سرنو دریافت کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہم اپنی دنیا میں ان بدیہی حقائق کو زیادہ مدت تک پس پشت ڈال کر کسی مہذب وجود کو اس کی بہترین شکل میں برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ روحانیت کا احساس ہی ان دو مذاہب بلکہ تمام مذاہب کے درمیان، افہام و تفہیم کی نئی بنیادیں فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی ہمارے بچوں اور آیندہ نسلوں کے مفاد میں ہے۔

Adarts HMPT-22/95

اخبار امت

سوڈان : امریکی سازشوں کا ہدف

مسلم سجاد

سوڈان کے خلاف امریکی سازشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ باغیوں کی حوصلہ افزائی اور پڑوسی ممالک سے حملے کروا کے اسلامی انقلاب کو ختم کرنے کی تدبیر کی جا رہی ہے۔ ۱۲ جنوری کو ایتھوپیا کی ۶ ہزار افواج اور ۲۲ ٹینکوں نے حملہ کر کے سرحدی قصبات کرموک' قیسان' یاردا اور مینزہ پر قبضہ کر لیا۔ ایتھوپیا اور اریٹریا کی سوڈان سے دشمنی کوئی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ سوڈان مخالف گروہوں کی سرپرستی اور تربیت اور ایس پی ایل اے کے جان گارانگ کی مکمل حمایت ان کی اعلان شدہ پالیسی ہے۔ ایتھوپیا کا دعویٰ تو نیل کے مشرق میں خرطوم تک کل سوڈانی علاقے پر ہے۔ اریٹریا نے سوڈان سے سفارتی تعلقات توڑ کر اس کے سفارت خانہ کو مخالف پارٹی نیشنل ڈیماکریٹک الائنس کے سپرد کر دیا ہے۔ حالیہ فوجی حملے میں سوڈان نے ان ملکوں کے فوجی گرفتار کیے ہیں لیکن یہ ملک یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کی فوج نے کارروائی کی ہے۔ سلامتی کونسل نے سوڈان کی شکایت پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ امریکہ نے موقف اختیار کیا کہ ایتھوپیا نے کچھ نہیں کیا ہے۔ سوڈان نے بتایا کہ ایتھوپیا نے جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی کی ہے اور شہریوں پر عورتوں اور بچوں پر مظالم کیے ہیں۔ کرموک اور قیسان کے اسکول کے ۸۰ طلبہ اور ۱۵ خواتین اساتذہ کو پکڑ کر لے گئے اور ان کے ساتھ زیادتی کی۔ متعدد سرکاری اہل کاروں اور علما کو گولی مار دی گئی۔ ۳ سے ۴ ہزار تک افراد لاپتہ ہیں۔ حقوق انسانی کی کسی انجمن نے کوئی نوٹس نہیں لیا!

سوڈانی جانتے ہیں کہ امریکہ کو اصل پریشانی سوڈان کے اسلامی عزائم سے ہے۔ انھیں بار بار بتایا جا رہا ہے کہ وہ اسلامی شریعت کا نفاذ ترک کر دیں تو ان کے سب مسائل حل کر دیے جائیں گے۔ صدر عمر البشیر کہتے ہیں کہ امریکہ ہمارے اسلامی رجحان سے' ہماری آزاد پالیسی سے' بیرونی مداخلت کو مسترد کرنے سے پریشان ہے۔ امریکہ کی حکمت عملی جنوب میں مسلح مزاحمت' مشرق میں نئے محاذ کھولنا اور خرطوم میں عوامی بغاوت پر مشتمل ہے۔ مخالف چاہتے ہیں کہ سوڈان کو اپنی افواج کو پوری سرحد پر پھیلانا پڑے اور اس کا دفاع کمزور ہو جائے۔

موجودہ حملے کا کامیابی سے مقابلہ کر لیا گیا ہے۔ دو قصبے' دشمنوں کے قبضے میں ہیں جنھیں جلد آزاد کروا

لیا جائے گا۔ سوڈانی دستوں نے اریٹریا میں سرحد سے آگے بڑھ کر باغیوں کو حملہ کرنے سے پہلے ہی تتر بتر کر دیا۔ باغیوں کی طرف سے فتوحات کے دعووں کے باوجود وہ منتشر حالت میں شکست سے دوچار ہیں۔ اب یوگنڈا میں سوڈانی سرحد پر فوجی تیاریوں کی خبر ہے۔

یوگنڈا' اریٹریا' ایتھوپیا اور روانڈا چار ممالک کے سربراہ لندن میں جمع ہوئے اور ٹائمز کے نمایندے کے مطابق امریکہ کی پرجوش پشت پناہی اور برطانیہ کی خاموش حمایت سے ان چاروں ممالک نے اپنی اپنی سرحدوں پر دشمنوں کی مسلح صفائی کی پالیسی تشکیل دی۔ یوگنڈا امریکی آشیرباد سے سوڈان پر براہ راست فوجی حملے کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ صادق المہدی اور عثمان المرغانی دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ حکومت سوڈان نے ان رہنماؤں کو جو آزادیاں دیں' انھوں نے انھیں مملکت سوڈان کے خلاف کارروائی میں استعمال کیا۔ دونوں خود بھی یقین رکھتے ہیں اور اپنے سرپرستوں کو بھی یقین دلا دیا ہے کہ اندرون ملک عوامی مزاحمت تیار ہے۔ انھوں نے سعودی اخبار الشرق الاوسط (۹ جنوری) کو بتایا کہ "ہم ۹۰ فی صد سوڈانیوں کی نمایندگی کرتے ہیں"۔ ان کا خیال تھا کہ سرحد پر حملہ ہو گا اور خرطوم میں عوام حکومت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئیں گے لیکن عملاً یہ ہوا کہ عوام خرطوم میں ہی نہیں' پورے ملک میں سڑکوں پر نکل آئے۔ مگر یہ احتجاج تھا بیرونی حملے کے خلاف! لاکھوں نوجوان محاذ پر جانے کے لیے بے تاب تھے' بہت سے مجاہدین کو واپس کرنا پڑا۔

سوڈان کے دشمنوں کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ جنوب میں جان گارانگ کی بغاوت ہر طرح کی سرپرستی کے باوجود موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اریٹریا کے دارالحکومت اسمارا میں قائم نیشنل ڈیماکریٹک الائنس نے بھی کوئی قابل ذکر کارگزاری نہیں دکھائی ہے۔ سوڈان کو غیر مستحکم کرنے اور اس کی بنیاد پرست حکومت کے خاتمے کے لیے نئی حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ حالیہ حملہ اسی کے تحت تھا جسے سوڈانی حکومت اور عوام نے اللہ کی مدد اور اپنی متحدہ طاقت سے ناکام بنا دیا ہے لیکن سوڈانی عوام کے لیے آزمایش کے مرحلے ابھی باقی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کے ٹھیکیدار کسی مسلمان ملک کو آزادی سے اپنے نظریات کے مطابق تہذیب و تمدن کی تشکیل کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ روشنی کی ہر کرن ان کی تاریکیوں کے لیے خطرہ ہے۔

مشرق وسطیٰ: بحران کا حل؟

کرنل (ر) غلام سرور

۱۵ جنوری ۱۹۹۷ کو یاسر عرفات اور نیتن یاہو کے درمیان جو سمجھوتہ طے پایا' اسے بڑے دور رس اثرات

کا حامل سمجھا جا رہا ہے۔ فلسطین کے صدر یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کے درمیان اس سمجھوتے کو طے کرانے میں امریکہ کے خصوصی ایلچی، ڈینس راس نے مصالحتی کردار ادا کیا۔ اس سمجھوتے کی رو سے، اسرائیل اور فلسطین کے مابین، دریائے اردن کے مغربی کنارے کے قصبے الخلیل کا انتظامی کنٹرول فلسطین کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اور طے پایا ہے کہ اسرائیلی فوج، الخلیل کا ۸۰ فی صد علاقہ خالی کر دے گی۔ تاہم بقیہ ۲۰ فی صد علاقے پر اسرائیل کا کنٹرول بدستور برقرار رہے گا، تاکہ وہاں مقیم ۴۰۰ اسرائیلی آباد کاروں کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا ہے کہ اس سمجھوتے کے نتیجے میں مغربی کنارے سے اگست ۱۹۹۸ تک اسرائیلی فوج کا مکمل انخلا عمل میں آ جائے گا اور ساتھ ہی اسرائیل سمجھوتے کی توثیق کے چھ ہفتوں کے اندر اندر مغربی کنارے کا دیہی علاقہ بھی خالی کر دے گا۔ اس طرح اگست ۱۹۹۸ تک اسرائیلی فوج کا انخلا مکمل ہو جائے گا۔ تاہم اس سمجھوتے کا اطلاق، یہودی آبادیوں اور فوجی علاقوں پر نہیں ہو گا۔

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بیس ہزار عربوں کے درمیان صرف چار سو یہودی آباد کاروں کی حفاظت کی آڑ میں بیس فی صد علاقہ اسرائیلی فوج کو سونپ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس معاہدے میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تصادم کے ممکنہ خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے الخلیل کے حساس علاقوں میں اسرائیلی اور فلسطینی فوجیوں کی مشترکہ گشت کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔

نیتن یاہو اور ان کی لیکوڈ پارٹی کا گذشتہ بیس سال سے یہ موقف رہا ہے کہ دریائے اردن پر اسرائیل کا ناقابل تقسیم اقتدار اعلیٰ قائم رہے گا اور پورے مغربی کنارے پر بلاشرکت غیرے، یہودیوں کے قبضہ کی ضمانت دی جائے گی۔ یہی وہ مطالبات تھے جنھوں نے نیتن یاہو کو اپنے عوام کی نظروں میں سربلند کیا ہوا تھا۔ حالیہ سمجھوتہ، بادی النظر میں اس کے سابقہ موقف کی نفی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ فطری بات تھی کہ اسے اس سمجھوتے کے بعد تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔ چنانچہ وزیراعظم کی اپنی لیکوڈ پارٹی کے متعدد اراکین اس معاہدے کی مخالفت میں پیش پیش دکھائی دیے اور اسی اختلاف کی بنا پر اس کی کابینہ کے وزیر بینی بیگن نے فوری طور پر استعفیٰ بھی دے دیا۔ کابینہ کے اجلاس میں وزیراعظم کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انھوں نے بعد میں اس معاہدے کی پارلیمنٹ سے منظوری حاصل کر لی۔ البتہ، پارلیمنٹ سے منظوری کے سلسلے میں نیتن یاہو کو خود اپنی جماعت کے ۴۶ اراکین کی حمایت حاصل کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برعکس، ان کی مخالف، لیبر پارٹی نے سمجھوتے کی حمایت کی، کیونکہ اس پارٹی کے موقف اور نیتن یاہو کی موجودہ سوچ میں کافی حد تک مماثلت اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ سمجھوتے کے خلاف، اسرائیلی عوام نے بھی زبردست احتجاج کیا۔ مختلف مظاہروں کے دوران، مقررین نے الخلیل پر اپنا "تاریخی حق" جتاتے ہوئے اسے فلسطینیوں کے سپرد کرنے کی مذمت کی۔ احتجاج کرنے والوں نے کتبے اٹھا رکھے تھے، جن پر جلی حروف میں درج تھا کہ "آج الخلیل کی سودے بازی ہوئی ہے۔ کل القدس کی باری آئے گی"۔

اور اب تصویر کا دوسرا رخ۔ مذکورہ سمجھوتے کی رو سے، الخلیل سے اسرائیل کی مکمل واپسی کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی ہے اور صرف ۴۰۰ یہودی آباد کاروں کے لیے ہزاروں اسرائیلی افواج کی تعیناتی دراصل "امن" کے نام پر صیونی "دخل عمل" کو جاری رکھنے کا دوسرا نام ہے۔

مذکورہ بالا منصوبے کی تفصیلات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اسرائیل فلسطین کو صرف "محدود" خود مختاری دینا چاہتا ہے اور بس۔ اس کے علاوہ وہ کسی قیمت پر بھی مقبوضہ علاقوں میں یہودی بستیاں ختم کرنے پر آمادہ نہیں۔ اسرائیل نے مقبوضہ فلسطین میں یہودیوں کی ۱۴۰ بستیاں بسا رکھی ہیں، ان بستیوں میں صرف مغربی کنارے پر تقریباً سوا لاکھ یہودی روس، پولینڈ، جرمنی اور آسٹریا سے لاکر بسائے گئے ہیں۔ اسرائیل، ان یہودی آباد کاروں کی حفاظت کے نام پر اپنی فوج کو نہتے فلسطینی عوام پر مسلط کرنے پر بضد ہے اور اس نے موجودہ معاہدے کی رو سے اپنی بات تسلیم بھی کرا لی ہے۔ ان آبادیوں کی توسیع بھی جاری رہے گی اور نئی بستیاں بھی تعمیر کی جائیں گی۔ نیتن یاہو نے ۲۲ جنوری کو ٹیلی وژن پر اعلان کیا کہ "ہم ان آبادیوں میں توسیع ماضی میں بھی کرتے رہے ہیں، اب بھی کر رہے ہیں، آیندہ بھی کریں گے"۔

اگرچہ اس سمجھوتے کے بعد اسرائیلی فوجوں نے الخلیل کے ۸۰ فی صد علاقے کا کنٹرول فلسطینی ارباب اختیار کے سپرد کر دیا ہے، تاہم اسرائیلی اور فلسطینی عوام میں مختلف مقامات پر اب بھی اکا دکا جھڑپوں کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ حال ہی میں فلسطینی عوام، جب نماز جمعہ ادا کرنے "مسجد ابراہیم" کی جانب جا رہے تھے، تو اسرائیلی فوجوں نے انھیں یہودی علاقوں سے گزرنے سے منع کر دیا تھا، جس سے صورت حال خاصی کشیدہ ہو گئی تھی۔

حال ہی میں یاسر عرفات نے ایک استقبالیہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یروشلم کو فلسطین اور اسرائیل کا مشترکہ دارالحکومت بنانے کی تجویز پیش کی ہے اور اپنے موقف کے حق میں یہ دلیل دی ہے کہ اگر روم، دو ملکوں کا پایہ تخت بن سکتا ہے تو پھر یروشلم کو یہ کردار ادا کرنے میں کیا دشواری پیش آ سکتی ہے۔ اسرائیل نے یاسر عرفات کی اس تجویز کو ناقابل عمل قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ نیتن یاہو یروشلم کو یک طرفہ طور پر اسرائیل کی ملکیت میں رکھنے پر مصر ہیں۔

ادھر حماس اور انتفاضہ کی تحریکیں، یاسر عرفات کو اسرائیل کی ضرورت قرار دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یاسر عرفات، فلسطین میں اسرائیل کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اگرچہ اوسلو معاہدے کے نتیجے میں ہزاروں مظلوم فلسطینیوں کی بے پایاں قربانیوں کے بعد الخلیل پر اسرائیل کا تسلط، جزوی طور پر ختم ہو گیا ہے لیکن پائیدار امن کی کوئی صورت ہنوز دکھائی نہیں دیتی۔ یہ صورت پیدا ہو بھی تو کیونکر، کہ حقیقی امن تو انصاف سے وجود میں آتا ہے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ فلسطینیوں کو ان کی سرزمین لوٹا دی جائے جس کے لیے اسرائیل کسی طور آمادہ نہیں۔ لہٰذا موجودہ سمجھوتے کے باوجود کشمکش جاری رہے گی۔

مسلم دنیا اور سائنسی ترقی

مسلم سجاد

انڈونیشیا کے دارالخلافہ جکارتا میں دسمبر ۹۶ میں مسلم دنیا کی ۴۰۰ اہم شخصیات اور نامور سائنس دانوں نے ایک "اعلان جکارتا" پر دستخط کر کے سائنس اور ٹیکنالوجی اور انسانی وسائل کی ترقی کا بین الاقوامی اسلامی فورم (IIFTIHAR) قائم کیا ہے۔ طائف کی اسلامی سربراہ کانفرنس (۱۹۸۱) نے سائنس ٹیکنالوجی اور ترقی کے لیے بین الاقوامی فاؤنڈیشن (IFSTAD) قائم کی تھی' جو اب عملاً معطل ہے۔ او۔ آئی۔ سی نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ایک کمیٹی (comstech) قائم کر رکھی ہے جس کا سالانہ اجلاس اور رپورٹ ہوتی ہے لیکن سائنس کی دنیا میں اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ نئے فورم سے یہ امید کی جا رہی ہے کہ ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر ایسا لائحہ عمل اپنائے گا جو نتیجہ خیز ثابت ہو۔

انڈونیشیا میں ۱۹۹۰ میں ایک مسلم انٹیلکچویل سوسائٹی قائم کی گئی تھی جس کے روح رواں پروفیسر حبیبی تھے جو اب ٹیکنالوجی اور ریسرچ کے وزیر ہیں۔ یہ سوسائٹی ملکی سطح پر ایک ایسا ادارہ تھی جہاں اہل علم اپنے سیاسی یا دیگر اختلافات کو ایک طرف رکھ کر معاشرے کی تہذیبی اور سائنسی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ سوچا گیا کہ یہ کام مسلم دنیا کے وسیع تر دائرہ میں کیوں نہ ہو؟ جون ۹۶ میں مکہ مکرمہ میں اس سوسائٹی اور پانچ دوسرے اداروں--- اسلامی ترقیاتی بینک' رابطہ عالم اسلامی' قرآن و سنت کے سائنسی معجزات کا کمیشن' اسلامی فکر کا بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ (III T) اور عربی اور اسلامی مدارس کی بین الاقوامی فیڈریشن--- کے سربراہوں نے طے کیا کہ وہ اسلامی اقدار کے مطابق' امن' عدل اور خوشحالی کی خاطر سائنس' ٹیکنالوجی اور انسانی وسائل کی ترقی کے لیے کام کریں گے۔ فورم کا قیام اس ارادے پر عمل کا نقطہ آغاز ہے۔ فورم نے ایک ۷ نکاتی منصوبہ عمل کے مطابق آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اپنے دور عروج میں مسلم دنیا سائنسی ترقی میں پیش پیش تھی۔ پھر دوسروں نے ہم سے سیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ ہم پس ماندہ ٹھہرے۔ آج پھر وقت کی ضرورت ہے کہ ہم ایک ایسی تہذیب دنیا کے سامنے پیش کریں جو جدید تہذیب سے زیادہ ترقی یافتہ اور انسانی اقدار کی زیادہ حامل ہو۔ مستقبل کے انسان کے لیے یہی راہ' راہ حیات ہے لیکن اس کے لیے ہمیں اپنی علمی پس ماندگی کے خول کو توڑ کر پیش رفت کرنا ہوگی۔ اگر یہ فورم اس سمت کچھ سفر کر سکے تو ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

ہم اس وقت کس صورت حال سے دوچار ہیں؟ دنیا کی آبادی کا ۵ واں حصہ' ایک ارب افراد' دنیا کے رقبے کے چوتھائی حصے' ۳ کروڑ مربع کلومیٹر' پر آباد ہیں۔ تیل کے ذخائر کا ۵۰ فی صد اور معدنیات اور خام مواد کا بیشتر حصہ ہمارے پاس ہے۔ لیکن ہماری کل مجموعی پیداوار' دنیا کی مجموعی پیداوار کا صرف ۵ فی صد ہے۔ تیل پیدا کرنے والے صرف ۴ ممالک کو امیر کہہ سکتے ہیں' ۶ متوسط' ۱۹ زیریں متوسط اور ۲۱ غریب

ممالک ہیں۔ ۱۹۹۴ کے آخر میں کل مسلم دنیا ۴۰۰.۳ بلین ڈالر کی مقروض تھی۔ اسلامی تعلیمات کو فراموش کر کے، سب ہی نے یہ سمجھ لیا کہ ترقی کرنے کا کوئی راستہ اس کے علاوہ نہیں کہ قرض لیا جائے، خواہ کتنا ہی سود دینا پڑے، خواہ کوئی بھی سیاسی قیمت ادا کرنا پڑے۔ انھوں نے سمجھا کہ خوشحال ہو کر سب قرض ادا کر دیں گے لیکن اس منزل کا دور دور پتا نہیں۔ ۱۹۹۴ میں مسلم ممالک کی آمدنی ۴۵۶۲ بلین ڈالر تھی جب کہ انھوں نے ۵۲۶۸ بلین ڈالر اصل اور سود میں ادا کیے۔ یعنی انھوں نے اپنی کل آمدنی سے ۶۷ بلین ڈالر زائد ادائیگی مزید قرض حاصل کر کے کی۔ پھر بھی سب مزید قرض لینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں جب کہ ان کے اقتصادی حالات دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں۔ مستقبل کی فکر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سائنسی ترقی اور تحقیقات کے لیے قومی بجٹ کا نصف فی صد مختص کیا گیا جب کہ ترقی یافتہ ممالک ۳۶۲ فی صد کرتے ہیں۔

ہر طرح کے وسائل سے مالا مال مسلم دنیا کو اس کے ذمہ داروں کی بے تدبیریوں اور غلط کاریوں نے مفلوک الحال اور پس ماندہ بنا رکھا ہے۔ جو امت قیادت عالم کے لیے مبعوث کی گئی ہے، وہ دوسروں کے آگے کشکول پھیلانے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ فورم کے اس اجلاس میں ترکی کے وزیراعظم نجم الدین اربکان، ملائیشیا کے وزیر خزانہ انوار ابراہیم، ترقیاتی بنک کے ڈاکٹر احمد محمد علی اور دیگر نامور افراد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدر سوہارتو نے افتتاح کیا۔ اربکان نے کہا کہ ترقی کی جس حکمت عملی کو اختیار کر کے ترکی تباہ ہوا، بلا سوچے سمجھے دوسرے ملک اسی کو اختیار کر کے، اسی تباہی سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی روایات، اقدار اور عقائد کے مطابق ترقیاتی حکمت عملی وضع کریں اور اسے اپنائیں۔ اسلام اور سائنس میں کوئی بعد اور مغائرت نہیں بلکہ اسلام تو سائنسی ترقی کے لیے ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔ مسلمان سائنس دان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ وہ کائنات کے بارے میں بنیادی حقائق سے آگاہ ہے، اپنا مقام پہچانتا ہے، اسے گم راہ ہونے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو معلومات اور ہدایات موجود ہیں، انھیں اختیار کر کے، آگے نئے نئے میدان کھلے پڑے ہیں۔ اگر مسلمان سائنس دان اس فورم کے تحت، اپنے طے شدہ لائحہ عمل کو اپنائیں گے، اور مومن کی شان سے پیش رفت کریں گے تو یقیناً جلد ہی سائنس کی دنیا میں ان کا منفرد وجود محسوس کیا جائے گا۔

یادرفتگاں

مکتوب گیلانی

اللہ کے نام سے جو موت و حیات کا مالک ہے۔ مکرم و محترم خرم جاہ مراد کی وفات حسرت آیات ہم سب کے لیے انتہائی صبر آزما سانحہ ہے۔ دنیا کی حقیقت بقول علامہ اقبالؒ ۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر   کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات
اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا   نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

فنا اور خاتمہ کے اس ابدی تواتر اور تسلسل میں ان افراد اور امتوں کے لیے استثنٰی ہے جو ابدی حقیقتوں پر ایمان و ایقان کی دولت سے سرفراز ہوں اور پھر ان کے مطابق عارضی زندگی گزار کر ابدی زندگی کے حصول کی دولت سے بہرہ ور ہوں۔ ان کے لیے فرمایا گیا ہے ۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام   جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ   عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام!

مجھے پختہ یقین اور کامل اعتماد ہے کہ مرحوم خرم جاہ اسی زمرہ اور طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے دنیا کی مستعار زندگی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رکھیں گے۔ ان کی علمی' ذہنی اور فنی خدمات ان کو کبھی دلوں اور ذہنوں سے محو نہیں ہونے دیں گی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم ان کی قربت' ان کے ایمان کی حرارت' ان کے انداز تربیت' ان کی لگن' ان کے اخلاص' ان کی للہیت اور مقصد کے لیے ان کے جذبۂ عشق و وارفتگی سے محروم ہو گئے۔ ایسی شخصیات جو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی صلاحیتوں سے انسانی سماج اور معاشرے پر بدرجہ کمال اثر انداز ہو رہی ہوں' بار بار انسانی سماج کو عطا نہیں ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجھے مرحوم کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا مگر ان کے رشحاتِ قلم مجھے ان کے دل گداز کا سوز اور حرارت. محسوس کرنے اور ان کی قربت کا لمس حاصل کرنے میں مانع نہیں بنتے تھے۔ میں جب بھی ان کی کوئی کتاب پڑھ لیتا تھا' میں محسوس کرتا تھا کہ اس شخص نے میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں غوطہ لگا کر میری تمناؤں اور آرزوؤں کے موتیوں کو بڑی خوبی اور مشاقی کے ساتھ چن لیا ہے۔ میرے جسم کا رواں رواں پکار اٹھتا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بھوپال کی علمی سرزمین سے گل سرسبز کی طرح کھل کر انھوں نے مملکت خداداد ارض پاک کو اپنی مسحور کن مہک اور خوشبو سے معطر کر دیا' انھوں نے مشرقی بازو کو پورے آٹھ سال تک اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ توانائی بخشی۔ جب یہ بازو اپنوں کی حماقتوں اور غیروں کی سازشوں سے کٹ گیا تو پورے ارض پاک میں شاید ان کو سب سے زیادہ قلق اور رنج محسوس ہوا ہو گا۔ ہم نے جب جب سقوط ڈھاکہ کے ملی سانحہ پر سوچا ہے' ایک غیبی آواز نے ہمیں چونکا دیا ہے ۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مرحوم انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر چکے تھے مگر قرآن فہمی اور قرآنی تعلیمات کا ورک ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس درجہ عطا کیا تھا کہ دینی درس گاہوں سے فراغت حاصل کرنے والے علما سے بھی اتنی تشفی نہیں ہو پاتی تھی جتنی ان کے درس قرآن سے حاصل ہو جاتی تھی۔ ہمارے ایک عزیز لندن میں ان کے ساتھ کافی عرصہ رہے تھے۔ ان کی زبانی اکثر سنتے رہے ہیں کہ مرحوم کے درس اور تربیتی پروگرام میں کتنی تشفی' لذت' گداز' سرور' تصور آخرت اور ایقان و ایمان کی دولت حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ صفات جمیلہ' مقصد اور نصب العین کے ساتھ عشق اور وارفتگی کی کیفیت پیدا ہو جانے سے ہی حاصل ہو جاتی ہیں۔ جہاں عشق کی چاشنی اور مہمیز نہ ہو' وہاں لغت ہائے حجازی کا کوئی قارون بھی ہو تو کچھ پلے نہیں پڑتا ہے۔ حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ نے بجا طور فرمایا ہے ۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

مقصدِ زندگی کے ساتھ عشق کا یہ تعلق اب خال خال ہی نظر آتا ہے اور جب اس صفت جمیلہ سے متصف کوئی ذات' رفیقِ اعلیٰ کی طرف کوچ کر جاتی ہے تو واقعی بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ خرم جاہ مراد کی وفات حسرت آیات سے ایسا ہی پُر نہ ہونے والا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ الا ماشاء اللہ تعالیٰ! بھوپال کی سرزمین میں تولد ہونے والا یہ مرد قلندر' کون جانتا تھا کہ فرنگیوں کی سرزمین میں آسودۂ خاک ہو گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

(سید علی گیلانی' سری نگر)

رسائل و مسائل

مقام تنعیم سے عمرہ کا حکم

فی زمانہ عوام الناس بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ مکہ معظمہ سے باہر مقام تنعیم وغیرہ بار بار جاتے اور وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کرتے ہیں۔ بعض اہل علم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایسا کرنا جائز تو ہے لیکن فی الواقع غیر مسنون اور غیر مشروع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔ جب یہ فعل غیر مسنون اور غیر مشروع ہے تو عوام الناس محض ایک جائز کام کے لیے زحمت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ غیر مسنون و غیر مشروع ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور فضیلت ختم ہو جاتی ہے۔

"مشروع" کا لفظ اصطلاحی طور پر دو جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے بارے میں کوئی حکم دیا ہو اور کوئی قانون نافذ فرمایا ہو' مثلاً شریعت اسلامیہ کا قانون ہے کہ کوئی آفاقی (کسی میقات حج سے باہر رہنے والا) جب موسم حج کے علاوہ کسی مہینے میں مکہ میں داخل ہونا چاہے تو احرام باندھ کر داخل ہو اور عمرہ ادا کرے۔ اس عمرے کو "مشروع" عمرہ کہا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے۔ اس لفظ کا دوسرا موقع استعمال پہلے موقع سے بہت عام ہے۔ ہر ایسی چیز کو جس کے لیے شریعت میں اذن موجود ہے' "مشروع" کہا جائے گا' یہاں تک کہ مباح اشیا بھی اس میں داخل ہیں' کیوں کہ "مباح" احکام شرع کی مستقل ایک قسم ہے' اور جہاں تک نفل عبادتوں کا تعلق ہے جن کی ترغیب' شریعت میں موجود ہے تو ان کے "مشروع" ہونے میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔ اس طرح تمام مندوبات و مستحبات اور نفل عبادتیں "مشروع" ہیں۔ کسی نفلی عبادت کو مطلقاً غیر مشروع کہنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح "غیر مسنون" کا لفظ اصل میں کسی خلاف سنت شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے تو اس کے اس فعل کو غیر مسنون کہا جائے گا لیکن میں نہیں جانتا کہ کسی ایسی چیز کو بھی علما و فقہا نے "غیر مسنون" کہا ہو جو شرعاً مباح ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ پلاؤ کھانا غیر مسنون ہے تو وہ اس لفظ کا صحیح محل پر استعمال نہیں کرے گا۔ اس بات میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ کام نہیں کیا اور اس بات میں کہ یہ کام "غیر مسنون" ہے' فرق کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص ایسی عبادت کو جس کی فضیلت بیان کی گئی ہو' "غیر مسنون" کہتا ہے تو اس کا یہ قول غلط ہے۔ میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے عمرے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے لیکن خود کبھی رمضان میں عمرہ ادا نہیں فرمایا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ "رمضان میں عمرہ ادا کرنا جائز تو ہے لیکن فی الواقع غیر

مسنون و غیر مشروع ہے کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں کبھی عمرہ ادا نہیں کیا ہے" تو ایسے شخص کے بارے میں یہی فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ شرعی اصطلاحات سے ناواقف ہے۔

اس ضروری توضیح کے بعد اب اصل مسئلے کو لیجیے: ۱۔ عمرے کی اہمیت و فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے یہاں تک کہ احادیث میں اس کے لیے "حج اصغر" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ۲۔ تمام عمر میں ایک بار عمرہ ادا کرنا امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک فرض ہے اور امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک سنت ہے۔ ۳۔ عمرے کی فضیلت میں جو احادیث آئی ہیں وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے عام ہیں۔ اس کے مخاطب اہل مکہ بھی اسی طرح ہیں جس طرح دوسرے مقامات کے باشندے۔ ۴۔ یہ بات بھی بلااختلاف ثابت ہے کہ عمرہ سال کے تمام ایّام میں کیا جاتا ہے (صرف یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے)۔

ان مسلمات سے ہی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ "حج اصغر" کی فضیلت و اجر حاصل کرنے کے لیے بار بار عمرہ کرے تو اس کے لیے یہ فعل مستحب اور باعث تکثیر اجر ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور ائمہ مذاہب اور فقہاے امت، اکثار اعتمار (بکثرت عمرہ کرنا) کو مستحب کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں ائمہ اربعہ میں صرف امام مالکؒ کا اختلاف منقول ہے۔ وہ سال میں ایک سے زیادہ عمرے کو مکروہ کہتے ہیں اور ان کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سال میں ایک سے زیادہ عمرہ کبھی نہیں کیا ہے۔ اہل مکہ تو الگ رہے، ان کے نزدیک تو مثال کے طور پر اگر ایسا ہو کہ --- ہندستان کا کوئی شخص عمرہ ادا کر کے اپنے گھر واپس آئے اور پھر اسی سال جا کر دوبارہ عمرہ کرے تو اس کا یہ فعل مکروہ ہو گا۔ ان کی طرف سے دی ہوئی دلیل کا جواب، جمہور کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ حضورؐ کے عدم فعل کو کراہت کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضورؐ کبھی کسی فعل کو مستحب سمجھنے کے باوجود اس کو صرف اس لیے ترک فرما دیتے تھے کہ کہیں امت، مشقت میں نہ پڑ جائے۔ ائمہ ثلاثہ اور جمہور فقہا کے علاوہ خود مسلک مالکی کے متعدد ائمہ نے اس مسئلے میں امام مالکؒ سے اختلاف کیا ہے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ امام مالکؒ نے کس پس منظر میں یہ بات فرمائی تھی کہ سال میں ایک سے زیادہ عمرہ کرنا مکروہ ہے لیکن ان کی طرف سے جو دلیل دی گئی ہے، وہ انتہائی کمزور ہے۔ یہ دلیل ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وقت میں کبھی ایک اسبوع (کعبے کے گرد سات چکر لگانا) سے زیادہ طواف نہیں کیا، اس لیے ایک وقت میں ایک سے زیادہ اسبوع مکروہ ہے اور اسی طرح اس کو پھیلاتے چلے جائیے تو بے شمار نفلی عبادات کی تکثیر مکروہ بن کر رہ جائے گی۔ جب تک خود امام مالکؒ کی صراحت نہ مل جائے کہ انھوں نے ایک سے زیادہ عمرے کو کیوں مکروہ کہا تھا اس وقت تک ان کی طرف اس قول کے انتساب میں بھی تامل ہوتا ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس سے اصولی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بکثرت عمرے کرنا مکروہ نہیں ہے بلکہ مستحب ہے لیکن بات صرف اصول پر ختم نہیں ہوتی۔ صحابہ کرامؓ کے عمل سے بھی تکثیر عمرہ کا

ثبوت ملتا ہے اور اس خاص جزیئے کی بھی دلیل موجود ہے جس پر گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلے صحابہ کے عمل کو دیکھیے۔ امام ابن قیم متوفیؒ ۷۵۱ھ نے "زاد المعاد" میں اور دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہر مہینے ایک عمرہ ادا فرماتے تھے اور انھوں نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اگر طاقت ہو تو اس سے بھی زیادہ عمرے کرنا بہتر ہے۔ حضرت انسؓ کے بارے میں آتا ہے کہ قیام مکہ کے ایام میں جب ان کے سر کے بال بڑھ جاتے تو وہ عمرہ کر لیتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یوں ہی سر کے بال کم کرانے یا منڈوانے کے بجائے عمرے کا اجر حاصل کر کے سر کے بال کم کراتے یا منڈواتے تھے۔ فتح القدیر، جلد نمبر ۲، ص ۳۰۶ میں سند کے ساتھ ترجمان القرآن، حضرت ابن عباسؓ کا وہ فتویٰ نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد حضرت طاؤس کو دیا تھا، انھوں نے فرمایا: "یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق کو چھوڑ کر ان سے پہلے اور ان کے بعد تم جس قدر چاہو، عمرہ کرو"۔

اس کے بعد جس مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے اس کا ثبوت ملاحظہ کیجیے۔ یہ صحیح ہے کہ خود نبی کریمؐ نے عمرہ کرنے کے لیے حدود حرم سے باہر جا کر تنعیم یا کسی اور مقام سے احرام نہیں باندھا اور عمرہ نہیں کیا لیکن آپؐ کے حکم سے حضرت عائشہؓ نے عمرے کا احرام باندھا تھا لیکن مکے میں داخلے سے پہلے ان کو ماہواری کا عذر پیش آگیا۔ وہ عمرے کے افعال انجام نہیں دے سکیں، پھر حضورؐ کے ساتھ حج سے فارغ ہوئیں۔ دوسری ازواج مطہرات نے چونکہ مستقلاً ایک عمرہ، حج سے الگ کیا تھا، اس لیے انھیں الگ عمرہ نہ کرنے کا رنج تھا۔ جب مکہ سے روانگی کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے رنج کا اظہار حضورؐ سے کیا، تب انھیں حضورؐ نے حکم دیا کہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ جا کر مقام تنعیم سے مستقل عمرہ کر لیں۔ یہ واقعہ تمام کتب احادیث میں مروی ہے اور امام بخاریؒ نے اس کو اپنی صحیح کے متعدد ابواب میں روایت کیا ہے۔ یہاں ابوداؤد کی ایک حدیث نقل کرتا ہوں: "عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی صاحبزادی حفصہ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن سے کہا: اے عبدالرحمٰن اپنی بہن عائشہ کو اپنی سواری کے پیچھے بٹھا لو اور ان کا عمرہ مقام تنعیم سے کرا لاؤ۔ جب ٹیلے سے نیچے اتریں تو وہاں عائشہ کو احرام باندھ لینا چاہیے اس لیے کہ وہ ایک مقبول عمرہ ہے" (ابوداؤد کتاب المناسک)۔ اس حدیث سے صراحتہ مقام تنعیم سے عمرہ کرنے کی فضیلت نکلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اہل مکہ کے لیے مقام تنعیم سے عمرہ کرنا دوسرے مقامات کے مقابلے میں افضل ہے اور یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز سے وہاں ایک مسجد، مسجد عائشہ کے نام سے بنی ہوئی ہے اور صدیوں سے اہل مکہ بلا نکیر وہاں جا کر عمرے کا احرام باندھتے ہیں۔ تنعیم کے علاوہ دوسرا مقام جہاں سے اہل مکہ عمرہ کرتے ہیں، جعرانہ ہے۔ اس لیے کہ یہاں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود غزوۂ حنین سے واپسی میں عمرہ ادا کیا ہے اور اسی لیے امام شافعیؒ کے نزدیک اہل مکہ کے لیے یہاں سے عمرہ کرنا افضل ہے۔

امام ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں اس مسئلے پر کئی فصلیں لکھی ہیں۔ ابن قیمؒ نے فصل اول میں جو کچھ

لکھا ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ آج کل جس طرح بہت سے لوگ مکہ سے باہر جا کر عمرہ کرتے ہیں اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کیا ہے۔ آپ نے جس عمرے کو شرع و قانون کا درجہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ "آفاقی" جب مکہ میں داخل ہو تو احرام باندھے بغیر داخل نہ ہو اور ایام حج کے علاوہ دوسرے ایام میں داخل ہو رہا ہو تو عمرہ ادا کرے۔ چونکہ انھوں نے زاد المعاد حضورؐ کی سیرت لکھی ہے اس لیے ان کو یہ بات واضح کرنی ہی چاہیے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چند سطروں میں اس کی وضاحت کر کے انھوں نے پہلی فصل ختم کر دی ہے۔ اس سے ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ بہت سے لوگ جو مکہ سے باہر جا کر عمرہ کرتے ہیں انھیں ایسا نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ فعل "غیر مسنون" اور "غیر مشروع" ہے۔ اگر ان کی عبارت سے کسی نے ایسا سمجھ لیا ہے تو صحیح نہیں سمجھا۔ اس کی دلیل خود زاد المعاد کی وہ فصلیں ہیں جو انھوں نے متصلاً پہلی فصل کے بعد لکھی ہیں۔ ان فصلوں میں ائمہ کے مذاہب، صحابہؓ کے عمل اور حضرت عائشہؓ کے واقعہ پر مفصل بحث موجود ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ امام ابن قیم حنبلی ہیں اس لیے ان کا اس مسئلے میں وہی مسلک ہو گا جو امام احمد بن حنبل کا ہے کیونکہ انھوں نے اس میں اپنے اختلاف کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اور امام احمدؒ ان ائمہ میں سے ہیں جو تکثیر عمرہ کو مستحب کہتے ہیں۔ مزید اطمینان کے لیے فقہ حنفی کی ایک تصریح یہاں نقل کی جاتی ہے۔ سوال یہ تھا کہ "آفاقی" کے لیے جب وہ مکہ میں مقیم ہو طواف افضل ہے یا نماز، اور اسی طرح ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کے لیے طواف افضل ہے یا عمرہ؟ اس آخری سوال کا جواب علامہ قاضی ابراہیم مکی نے یہ دیا ہے: "اگر کوئی شخص مسلسل اتنی دیر تک طواف کرتا رہے جتنی دیر میں وہ ایک عمرہ ادا کرتا ہے تو طواف افضل ہے ورنہ عمرہ افضل ہے"۔

قاضی ابراہیم کا یہ جواب علامہ ابن عابدین نے "درمختار" کی شرح میں نقل کیا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک عمرہ ادا کرنے میں چار گھنٹے وقت صرف ہوتا ہے تو جب تک کوئی شخص چار گھنٹے تک طواف نہ کرتا رہے، ایک عمرے کے برابر اجر حاصل نہیں کر سکتا۔ عمرے کی فضیلت کے کئی دیگر پہلو ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بدنی، اور مالی دونوں عبادتوں کو جمع کر لیتا ہے کیونکہ عام طور پر حجاج سواری پر تنعیم جاتے اور آتے ہیں، اس کے علاوہ حلاق (بال مونڈنے والے) کو بھی کچھ پیسے دیے جاتے ہیں۔ (سید مروج احمد قادری)

کتاب نما

سفرنامہ ہند' پروفیسر محمد اسلم۔ ناشر: ریاض برادرز' ۴۰ اردو بازار لاہور۔ صفحات: ۵۱۹۔ قیمت: ۲۲۵ روپے۔

مصنف حرف آغاز میں لکھتے ہیں: "راقم الحروف نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۸۶ تک بھارت کے تاریخی' علمی' دینی اور روحانی مراکز کے بار بار دورے کیے اور بعض اوقات اچانک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کبھی کسی بھارتی مسلمان اسکالر کے قدم بھی نہ پڑے تھے۔ چہ جائیکہ کوئی پاکستانی اسکالر وہاں پہنچتا"۔ بلاشبہ اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ بھارت کا ایسا مفصل اور اتنے کثیر مقامات کا سفرنامہ نہیں لکھا گیا۔ مصنف پنجاب یونی ورسٹی میں شعبہ تاریخ کے پروفیسر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے بقول: ملفوظات کے موضوع پر' مخطوطات کی تلاش میں بھارت کی بڑی بڑی لائبریریوں کی خاک چھانی ہے اور اس طرح تمام اہم درگاہوں میں حاضری کی سعادت حاصل کی ہے۔ بھارت کے دینی اور روحانی مراکز کو ایک سے زائد مرتبہ دیکھا ہے۔ اس طرح (انھیں) وہاں بہت سے اساطین علم سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جو' اب دنیاے فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔

پروفیسر موصوف کے بعض اسفار کی روداد پاکستانی جریدوں ("بینات" "الحق" اور "العلم") میں شائع ہوتی رہی ہے۔ اب انھیں متعدد اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان اقساط کو یکجا کرتے ہوئے ترتیب زمانی کو مدنظر رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ بہ حالت موجودہ بھی یہ ایک دلچسپ اور حد درجہ قابل مطالعہ سفرنامہ ہے۔ کسی کتاب کی مقبولیت بڑی حد تک اس کی مطالعہ پذیری (readability) پر منحصر ہوتی ہے' اس لحاظ سے "سفرنامہ ہند" ایک کامیاب سفرنامہ ہے اور اپنے مخصوص انداز کا بھرپور تاثر پیش کرتا ہے۔

مصنف کو قبروں' قبرستانوں اور مقبروں اور مزاروں سے غایت درجہ دلچسپی ہے۔ کسی مقام پر اچانک کسی بزرگ کی قبر کا انکشاف انھیں مسرت و شادمانی سے سرشار کر دیتا ہے۔ وہ بھارت کے طول و عرض میں بڑے بڑے معروف شہروں سے لے کر دور دراز قصبوں اور دیہاتوں تک میں مدفون بزرگان دین کی قبروں تک پہنچے۔ اس ضمن میں ان کی معلومات وسیع اور حیرت انگیز ہیں۔ وہ علم الانساب پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے اکثر و بیشتر قبروں کے کتبے اور الواح بھی نقل کر دی ہیں۔

پروفیسر محمد اسلم' قاری کی انگلی پکڑ کر لیے چلتے ہیں اور ایک ماہر اور باخبر راہنما کی طرح اسے قریہ بہ قریہ

اور کو بہ کو بہ گھماتے اور مقابر و مزارات دکھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ایک طرح کی رننگ کمنٹری بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ تاریخی معلومات کے ساتھ، وہ کہیں کہیں جغرافیائی حدود اربعہ بھی بتا دیتے ہیں۔ کبھی کچھ تبصرہ بھی ہو جاتا ہے۔ آگرے میں اکبر کے مقبرے تک پہنچے تو بتایا ہے کہ اسے مغلوں کے آخری دور میں بڑا نقصان پہنچا۔ چورامن جاٹوں نے اکبر کی قبر کھدوا کر، اس کی ہڈیاں جلا کر اس کی راکھ جمنا میں بہا دی اور مقبرے سے چاندی کے دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے گئے (ص ۳۶۱)۔

دیوبند میں پروفیسر موصوف نے بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا اصل وصیت نامہ دیکھا جس میں یہ درج ہے کہ مدرسے کے لیے حکومت سے کسی بھی قسم کی امداد قبول نہ کی جائے اور زمینداروں اور جاگیرداروں سے مستقلاً کوئی رقم وصول نہ کی جائے، اس مدرسے کو محض توکل علی اللہ چلایا جائے۔ بعض واقعات سے مسلم بادشاہوں کی وسیع القلبی خصوصاً اورنگ زیب عالمگیر کی بے تعصبی اور غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے شواہد ملتے ہیں (ص ۳۰۹)۔

سفرنامہ پڑھتے ہوئے احساس یہ ہوتا ہے کہ پروفیسر موصوف "ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں" کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ کہیں تو ایک ایک، دو دو روز رکتے ہیں، کہیں فقط چند گھنٹے قیام کرتے ہیں اور کسی مقام پر چند لمحوں کے لیے، زیارت قبور کرنے کے بعد، وہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی ایک بڑی دلچسپی کتب خانوں، کتابوں اور مخطوطات سے ہے۔ وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ جیسے شہرہ آفاق کتب خانے سے لے کر احمد آباد کی وِدیا سبھا لائبریری تک میں گئے، مطلوبہ معلومات جمع کیں اور بعض نادر مخطوطات نقل کیے۔ ایک ایک دن انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی پٹیالہ اور پنجاب یونی ورسٹی چنڈی گڑھ میں، وہاں کے پروفیسروں کی معیت میں بھی گزارا۔

"سفرنامہ ہند" میں بھارت سے متعلق طرح طرح کی معلومات ملتی ہیں۔ مختلف شہروں اور قصبوں کا محل وقوع اور ان کے درمیانی فاصلے، بہتر ذریعہ سفر، کسی شہر کی وجہ شہرت یا اس سے متعلق کوئی معروف شخصیت یا کوئی تاریخی واقعہ وغیرہ۔ منماڑ سے اورنگ آباد جاتے ہوئے ریل کے سفر میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ بتاتے ہیں کہ میں رات کا کھانا تناول کرنے ریلوے کے ریستوران میں گیا۔ اتفاق سے ایک مسافر، جو ٹرین میں میرے برابر والی سیٹ پر سفر کر چکا تھا، وہاں موجود تھا۔ میں نے ویجی ٹیرین کھانے کا آرڈر دیا۔ اس نے بھی کھانا منگوایا۔ ہم آمنے سامنے میز پر بیٹھے تھے۔ اس نے ایک ہتھیلی پر گلاس سے پانی ڈالا اور اسے اپنے سامنے میز پر اس انداز سے گرایا کہ اس کے اور میرے درمیان پانی کی دیوار حائل ہو گئی۔ اس سے وہ ایک مسلمان کے مسموم اثرات سے اپنے کھانے کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دیر تک اس کی ذہنیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میرے دل میں خیال آیا کہ اگر یہ اس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرتیں نہ رکھتے اور

چھوت چھات کے قائل نہ ہوتے تو مسلمانوں میں ضم ہو جاتے۔ ایسی ہی مجنونانہ حرکات نے انھیں مسلمانوں سے، بلکہ یوں کہیے کہ اسلام کی روشنی سے دور رکھا (ص ۳۴)۔ بعض دیگر مواقع پر بھی مصنف کو ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کا اندازہ ہوا۔

کتاب علمی اعتبار سے بھی معلومات افزا ہے۔ اس میں رجال و شخصیات کے بارے میں خاصی قیمتی معلومات ملتی ہیں۔ ناموں کے ساتھ قوسین میں بالعموم سنہ وفات درج ہے۔ مصنف قاری کو شہروں کے ساتھ وہاں کی اہم تاریخی مسجدوں، مدرسوں، مکتبوں، جامعات، مختلف اداروں اور تاریخی آثار کی سیر بھی کراتے ہیں۔ مصنف نے منظر نگاری یا جذباتی انداز نگارش سے اجتناب کیا ہے۔ ان کے ہاں بہت سے سفر ناموں کے برعکس حقیقت و واقعیت نمایاں ہے۔ انھیں باغ و راغ کے بجائے، رجال و شخصیات اور تاریخی آثار سے دلچسپی ہے۔ کتاب کے آخر میں بہت سے مزارات، مقابر اور عمارتوں کی تصاویر شامل ہیں۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔

ہندستان ۱۹۴۷ میں تقسیم ہو کر، دو الگ ممالک پاکستان اور بھارت کی شکل اختیار کر گیا۔ پروفیسر محمد اسلم کے سارے سفر ۱۹۴۷ کے بعد کے ہیں، اس لیے کتاب کا نام "سفرنامہ بھارت" زیادہ صحیح ہوتا۔ (رفیع الدین ہاشمی)

جیلانی بی اے کی کہانی، ڈاکٹر تصدق حسین راجا۔ ناشر: مکتبہ دانیال حیدر راجا، ۱۱۴ اے، گلی ۵۵، جی ۱۰/۳ اسلام آباد۔ صفحات: ۲۰۹۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

جیلانی بی اے (وفات: ۱۹۹۰) کا نام پاکستان کے سیاسی، خصوصاً تحریک اسلامی کے، حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ ادب اسلامی کے چوٹی کے افسانہ نگار اور ادیب تھے۔ بعدازاں انھوں نے دنیائے ادب و افسانہ سے خود اختیاری جلاوطنی اختیار کی۔ ان کی بقیہ زندگی "چودھری غلام جیلانی" کی حیثیت سے عملی سیاست کے کوچے میں بسر ہوئی۔ جماعت اسلامی کے ایک فعال کارکن اور راہنما کے طور پر، مختلف ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ آخری زمانے میں وہ کئی برسوں تک ہفت روزہ "ایشیا" کے مدیر رہے۔ اس حیثیت میں انھوں نے ملک نصراللہ خاں عزیز (وفات: ۱۹۷۶) کی بہترین صحافتی روایات کو قائم رکھا، بلکہ اپنے خوب صورت اسلوب تحریر کے ذریعے اردو کی صحافتی نثر کو ایک معیار عطا کیا۔ جیلانی بی اے کی شخصیت، افسانہ نویسی اور صحیفہ نگاری کے مختصر اور ابتدائی جائزے کے طور پر، زیر نظر کتاب ایک خوش آیند کوشش ہے۔

جیلانی نہایت منکسر المزاج، حلیم الطبع اور شگفتہ مزاج شخص تھے۔ مصنف نے ان کی افسانہ نویسی کے

جائزے میں بجا طور پر ان کے وسیع مطالعے خصوصاً مغربی افسانوی ادب میں ان کی گہری دلچسپی اور تنقیدی و تجزیاتی بصیرت کا ذکر کیا ہے۔ سوانح کے باب میں مصنف کی کاوش سے زیادہ اصل چیز جیلانی کے خطوط (بہ نام اعجاز احمد فاروقی) ہیں جو ادب، تہذیب، ثقافت، زندگی، ایمان، خیر و شر اور فرانسیسی، روسی اور انگریزی افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کے فن کے بارے میں جیلانی کی دانش و بینش کی بڑی متاثر کن جھلک پیش کرتے ہیں۔ اس تاثر میں ان کے خوب صورت نپے تلے جملے اور سادہ مگر دل کش، خوب صورت اسلوب کا بھی بڑا دخل ہے، مثلاً: "محض خوب صورت الفاظ کا لکھ لینا ہی بڑائی نہیں، بلند ادب کی پہچان یہ ہے کہ اس میں انسانی فطرت کے راز آشکار ہوں" (ص ۳۹)۔ "دنیا کے بعض معاملات کتابوں سے نہیں معلوم ہوتے صرف زندگی کا تجربہ ہی ان کو منکشف کرتا ہے" (ص ۴۲)۔ "محض پھولوں کی زبان ادب کے لیے کافی نہیں، جب تک انسانی نفس کی حقیقتیں اس میں پوشیدہ نہ ہوں" (ص ۴۴)۔ "میرے نزدیک ایمان، ادب میں مانع نہیں بلکہ مولانا رومؒ اور اقبالؒ پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس ایمان کو اساس ادب بنایا جائے--- اگر ایمان تخلیقی صلاحیت کے لیے مہلک اثر رکھتا تو پچھلی نصف صدی میں نہ تو آپ کو کوئی نذیر احمد ملتا، نہ اکبر، نہ حالی" (ص ۴۷)۔ "فلسفہ نام ہے آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچ بچار کرنے کا۔ داعی سراپا شعلہ و اضطراب ہوتا ہے جبکہ فلسفی سراپا سکون اور گیان ہے۔ فلسفی عمل کی دنیا سے دور رہتا ہے۔ وہ تماشائی کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھنا چاہتا لیکن داعی جو کچھ کہتا ہے، اس پر شہادت دینے کے لیے اپنی جان و مال تک کی بازی لگا دیتا ہے" (ص ۱۱۲)۔

جیلانی کے ایک قریبی دوست اور مداح ڈاکٹر محمد یوسف عباسی نے اعتراض کیا تھا کہ جماعت اسلامی نے جیلانی سے افسانہ نگار کا قلم چھین کر اسے اداریہ نویسی اور سیاسی مضامین لکھنے پر لگا دیا۔ عباسی صاحب کا کہنا تھا کہ "اذان"، "بلعم بن بعور"، "موت کب آتی ہے" اور "چارلس ڈبلیو فلپس کا کیس" جیسے شاہکار افسانے لکھنے والوں کو جماعت کے پرچے (ایشیا) کی ادارت تھما دینا ایسا ہی ہے، جیسے کسی معمار کو گورکن بنا دیا جائے۔ زیرِ نظر کتاب کے مولف ڈاکٹر تصدق حسین راجا اس بارے میں لکھتے ہیں: عباسی صاحب ضرور اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ سب عشق کے معاملات ہیں۔ قبلہ بدل جائے تو انسان کا رخ خود بخود بدل جاتا ہے۔ کئی ادیب ایسے ہیں جن کی ادبی زندگی کی ابتدا افسانے لکھنے سے ہوئی۔ پھر وہ تاریخ نویسی سے ہوتے ہوئے "سیرت نگاری" کی وادی میں داخل ہو گئے۔ وہ اب لاکھ کوشش کر دیکھیں، افسانہ نہیں لکھ سکتے۔ قلم رک رک جاتا ہے اور شکوہ کرنے لگتا ہے کہ قلم کار اسے کہاں لیے جا رہا ہے۔ میری ذاتی رائے میں جیلانی اردو افسانہ نگاری میں جو کچھ ہمیں دے گیا، اس کا حصہ اتنا ہی کچھ تھا اور ہمیں جیلانی کی صحافتی اور سماجی زندگی کی فتوحات کو سامنے رکھ کر ان شاہکار افسانوں کے تخلیق نہ ہو سکنے کا ماتم نہیں کرنا چاہیے (ص ۱۲۶)۔

مصنف نے جیلانی کے افسانوں اور صحافتی تحریروں کا عمدہ تعارف کرایا ہے۔ آخری باب میں جیلانی کی ایک تلخیص کتاب (صبح سمرقند) اور پس مرگ شائع شدہ مجموعے (بہار کے پہلے پھول) پر تبصرہ کیا ہے۔ جیلانی نے ایک پادری کارلوسانیگو کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا ("ماؤزے تنگ کے دیس میں" مکتبہ چراغ راہ' کراچی)۔ زیر نظر کتاب کو پڑھتے ہوئے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جیلانی کے ادبی سرمائے کا زیادہ وسیع اور گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے' اور یہ بھی کہ مرحوم کی باقی ماندہ تحریروں کو تلاش کر کے مدون و شائع کرایا جائے' خصوصاً ان کے خطوط کو جمع و مرتب کر دیا جائے تو یہ مجموعہ' جیلانی کی دانش ورانہ ذہانت اور ادبی و تنقیدی ذہن کا بڑا عمدہ نمونہ ہو گا۔ اعجاز احمد فاروقی نے تقریظ میں بالکل صحیح کہا ہے: "جیلانی کا ادبی مرتبہ و مقام اور کاشری بیوشن تو آنکھ اوجھل' پہاڑ اوجھل ہو گیا اور اس کی دریافت ثانی کسی فرہاد کوہ کن کی سی محنت اور لگن چاہتی ہے"۔

ڈاکٹر تصدق حسین راجا کی یہ کاوش اس اعتبار سے قابل ستایش ہے کہ انھوں نے یہ کتاب محض اپنے ذوق و شوق سے تالیف کی ہے۔ امید واثق ہے یہ' جیلانی بی اے کے تعارف کا بہت اچھا ذریعہ ثابت ہو گی (ر-ہ)

روحِ انقلاب' صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی۔ ناشر: اتحاد فاؤنڈیشن' لاہور۔ صفحات: ۲۲۸۔ قیمت: ۱۳۰ روپے۔

وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و جرائد میں شائع شدہ ان مضامین کو کتابی صورت میں اس لیے یک جا کیا گیا ہے کہ ان سب میں کسی نہ کسی حوالے سے "انقلاب" کا تذکرہ ہے۔ ابتدا میں بعض مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف (یا مقرر) "انقلاب برائے انقلاب" کی بات کر رہے ہیں لیکن آگے چل کر بہ تکرار اسلامی انقلاب کا تذکرہ آتا ہے۔ اسلام کے نام پر روا رکھے جانے والے' کسی بھی قسم کے' استحصال کے خلاف خورشید گیلانی صاحب ننگی تلوار بنے نظر آتے ہیں۔ مصنف اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بعض سنجیدہ حلقے بھی "اصلاح کے بجائے انقلاب" کی حمایت کو ایک جذباتی اور ناپختہ رویہ قرار دیتے ہیں' مگر مصنف کے خیال میں یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو انقلاب کو تشدد اور انارکی کا ہم معنی لفظ قرار دیتے ہیں' بلکہ ہمارے نزدیک وہ انقلاب ابھی خام اور ناپختہ ہے جو صرف خونی دروازے سے برآمد ہو" (ص ۴۵)۔ ان کے خیال میں جو انقلاب: "پرانی اقدار کو شکست و ریخت سے دوچار تو کردے لیکن معاشرے کو نئی اقدار نہ دے سکے' وہ یک رخا انقلاب ہے"۔ وہ اس بات کی بھرپور وکالت کرتے ہیں کہ جامع اور "متوازن انقلاب" صرف اسلامی انقلاب تھا' اس سلسلے میں وہ نبیؐ اور دیگر انبیا کی انقلابی کاوشوں کا تفصیلاً ذکر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک علمی بحث ہے جو کتاب کے آخر

مضامین میں بکھری ہوئی ملتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ کتاب خشک فکری بحثوں کا مجموعہ نہیں' اظہار جذبات کا مرقع ہے۔ اصل زور یہاں "انقلاب" کی شدید خواہش پیدا کرنے اور "انقلاب" سے توقعات (خصوصاً معاشی انصاف کی توقعات) وابستہ کروانے پر ہے۔ انداز بیان تحریری سے زیادہ تقریری ہے۔ شاید اسی وجہ سے کتاب میں رموز اوقاف اور حوالہ جات کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ پرشکوہ الفاظ کا سحراور بیان کا بہاؤ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ طباعت بھی نہایت عمدہ ہے۔ اس سب کچھ کا مجموعی اثر یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر محمد امین: "کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا"۔ (ڈاکٹر بلال مسعود)

Islamic Civilization in its Real Perspective ' تالیف: مولانا صدر الدین اصلاحی۔ مترجم: اسرار احمد خان۔ ناشر: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' پان والی کوٹھی' دودھ پور' علی گڑھ۔ صفحات: ۳۱۷۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

اقامت دین کی تحریک میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو جن حضرات کا بھرپور قلمی تعاون حاصل ہوا' ان میں مولانا صدر الدین اصلاحی بھی شامل تھے۔ مولانا موصوف کی اردو تصنیفات "اساس دین کی تعمیر" "فریضہ اقامت دین" اور "دین کا قرآنی تصور" اردو دان طبقے سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کا ایک مفصل مقالہ "معرکہ اسلام و جاہلیت" کے نام سے "ترجمان القرآن" کی تیرھویں جلد میں چھ اقساط میں شائع ہوا تھا۔ عدیم الفرصتی اور ضعف صحت کے سبب وہ ایک عرصے تک اس پر نظرثانی نہ کر سکے۔ ۱۹۸۳ میں انھوں نے مقالے پر نظرثانی کی اور اس میں کچھ اضافوں کے بعد اسے کتابی صورت میں شائع کرایا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ڈاکٹر اسرار احمد خان (استاد بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کوالالمپور' ملائشیا) نے مذکورہ کتاب کو انگریزی زبان میں منتقل کیا ہے اور زبان و بیان پر نظرثانی میں ان کی معاونت ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی نے کی۔

اصلاحی صاحب کے اسلوب تحریر میں سب سے نمایاں چیز زبان و بیان کی سلاست ہے۔ وہ استدلال آیت قرآنی سے لاتے ہیں۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مباحث: جاہلیت کی جامع تعریف' نوحؑ' عادؑ' ہودؑ' شعیبؑ اور انبیائے سابقہ کی قوموں کی جاہلیت' قرن اول کے لوگ کس بنا پر ہدایت سے انکار کرتے تھے' اسلام میں جاہلیت کیسے داخل ہوئی' جاہلیت کے مصادر کیا ہیں اور اس سے اسلامی کردار کی کس کس رخ پر بیخ کنی ہوئی وغیرہ۔ آخری باب میں اسلام کی طرف لوٹنے والوں اور اس کا کلمہ بلند کرنے والوں کے حوالے سے مفید گفتگو ہے۔

ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں ہو بہو منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ زیر نظر کتاب کے مترجم کو بھی اس کا احساس ہے۔ اسی لیے انھوں نے دیباچے میں اس مشکل کا تذکرہ کر دیا ہے اور اسی لیے قرآنی آیات کا ترجمہ انھوں نے علامہ محمد اسد کے انگریزی ترجمہ قرآن سے لیا ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے یہ ترجمہ قابل قبول ہے۔ بظاہر کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا۔ مصنف کے خیالات کو ان کی روح سمیت انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم کہیں کہیں مترجم بے بس نظر آتا ہے اور وہ اردو اور عربی الفاظ کو حواشی میں بغیر وضاحت کے درج کر دیتا ہے۔ چند مقامات پر مترجم نے اردو پیراگراف ختم کر دیے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ بہرحال انگریزی داں حضرات، عوام و خواص، خصوصاً دینیات وسیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب کو مفید پائیں گے۔ انگریزی اسلامی ادب میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ طباعت معیاری، کاغذ عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ (محمد ایوب منیر)

بچوں کی لائبریری، کیوں اور کیسے؟ از پروفیسر مقصود احمد۔ ناشر: اسلامی نظامت تعلیم پاکستان، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۳۰۔ قیمت: درج نہیں۔

پروفیسر مقصود صاحب نے ۳۰ صفحات کے کوزے میں معلومات اور عملی رہنمائی کا دریا جمع کر دیا ہے۔ اسلامی نظامت تعلیم نے تعلیمی اداروں کے لیے نہایت مفید کتاب پیش کی ہے لیکن اس لطیفے کے ساتھ کہ مندرجات کے نمبر۹ "سمعی و بصری معاونات" کے بعد نمبر۱۰ "چند اہم کتب خانے"، متن میں (ص ۲۵) "بچوں کے کتب خانے" ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کے مندرجات نمبر۱۱ جماعت وار کتب، نمبر۱۲ "بچوں کے رسائل" اور نمبر۱۳ "ناشران کتب" موجود نہیں ہیں۔ (غالباً اسی لیے مندرجات پر صفحات نمبر نہیں ہیں)۔ معلوم نہیں ناشر کو جلدی تھی یا مصنف کو؟ (مسلم سجاد)

ابلیسی مغالطے، محمد شریف قاضی۔ ناشر: فیروز سنز، لاہور۔ صفحات: ۱۳۵۔ قیمت: درج نہیں۔

فریب ابلیس، محمد شریف قاضی۔ ناشر: فیروز سنز، لاہور۔ صفحات: ۱۰۱۔ قیمت: درج نہیں۔

ابلیس انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اس نے آدم کو نہ صرف جنت سے نکلوایا بلکہ اس کے زمین پر آباد ہونے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ہر طرف سے آدمی پر حملہ آور ہوتا ہے اور ہر حیلے بہانے اسے راہ حق سے بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے حربے اتنے مرموز اور زبردست ہوتے ہیں کہ ان سے بچنا عام طور پر آسان نہیں ہوتا۔ شیطان کے شر سے وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو ہر حال میں اللہ سے ڈرتے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے شیطان کے حربوں کی نوعیت اور حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا ہے لیکن عام لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لیے ایسی تحریروں کی

ضرورت رہی ہے جو سادہ' عام فہم اور دلکش اسلوب میں لکھی گئی ہوں۔ کسی زمانے میں علامہ ابن جوزی نے "تلبیس ابلیس" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی تھی جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اس کا انداز بیان عالمانہ ہے اس لیے ہر شخص اس سے شاید مستفید نہیں ہو سکتا۔ جناب محمد شریف کی زیر تبصرہ کتابیں اس اعتبار سے غنیمت ہیں کہ ان میں ابلیس کے گمراہ کن حربوں اور اس کی وسوسہ اندازیوں سے لوگوں کو بخوبی آگاہ کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب کا اسلوب عام فہم ہے۔ انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت فرامین الٰہی کا ترجمہ اور توضیح و تشریح درج کر دی ہے جس سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قرآن مجید کو براہ راست سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس طرح اپنے فکر و عمل کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

نُورٌ عَلٰی نُور ' سید نظر زیدی۔ ناشر: صبح صادق پبلی کیشنز' بی۔۳ وحدت روڈ' لاہور۔ صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

نظر زیدی صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور شعر و ادب کو اخلاقی اور مثبت قدروں کی ترویج کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا زیر نظر شعری مجموعہ حمد و نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ ہمارے بعض شعرا حمد اور نعت میں حد فاصل قائم رکھنے میں محتاط نہیں رہتے۔ زیدی صاحب نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام تر عقیدت و محبت کے باوجود' ناروا مبالغے سے اجتناب کیا ہے اور پوری طرح حد ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ ایک حصے میں "احسن الکلام" کے تحت بعض احادیث نبویؐ کے مفہوم کو چھوٹی چھوٹی نظموں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مختصر نظمیں مفید' موثر اور سبق آموز ہیں۔ (ر۔ ہ)

معلم النحو' معلم الصرف' تبویب الصرف' تعلیل الصرف ' مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی۔ ناشر: الرحیم اکیڈمی' اے ۷/۷ اعظم نگر' لیاقت آباد' کراچی ۱۹۔ صفحات: علی الترتیب ۸۸' ۶۴' ۸۰' ۸۸۔ قیمت: درج نہیں۔

دینی مدارس میں عربی گرامر کے نصاب میں پرانی طرز کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور وہ بھی بالعموم فارسی میں ہیں۔ "سلسلہ عربی نصاب جدید" کے تحت یہ چار کتابچے مبتدیوں کے لیے مفید ہیں۔ گرامر کو سوال و جواب کی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔ قابل فہم ہے اور کسی اکتاہٹ کے بغیر پڑھا جا سکتا ہے۔ عربی زبان کے طلبہ کے علاوہ' عام شائقین بھی اسے مفید پائیں گے۔ (عاصم نعمانی)

مدیر کے نام

ثوبیہ ہاشمی ' حیدر آباد

جنوری ۹۷ کا شمارہ تو محترم خرم مراد کا خصوصی نمبر محسوس ہوا۔ ان کی متعدد چیزیں شامل اشاعت تھیں' خصوصاً اشارات تو گویا ان کا الوداعی پیغام تھے: دنیا کی امامت سنبھالنا ہے تو یہ دس سلگتے مسائل حل کرو!

عبدالرحمٰن ' کراچی

سلگتے مسائل (جنوری ۹۷) تحریکی حلقوں میں غور و فکر کا موضوع بننا چاہیں' انفرادی ہی نہیں' اجتماعی بھی۔ اور اس غور و فکر کے نتائج کو عام بھی ہونا چاہیے۔ کوئی ادارہ سلسلہ مطالعات بھی پیش کر سکتا ہے۔

طاہر رفیق ' راولپنڈی

اپنی تربیت کیسے کریں (نومبر' دسمبر ۹۶' جنوری ۹۷) کی تکمیل کا شدت سے انتظار تھا۔ اگر مصنف کی پوری اسکیم اور نکات موجود ہوں تو ان کے کسی ساتھی کو اسے مکمل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ تین اقساط بھی تربیت کے خواہش مندوں کے لیے رہنمائی کا بہت کچھ بنیادی سامان رکھتی ہیں۔

سلیم منصور ' گوجرانوالہ

دعوت الی الخیر کی ذمہ داری (جنوری ۹۷) ہر مسلمان کے لیے خصوصاً دیار غیر میں بسنے والی مسلمانوں کی کثیر آبادیوں کے لیے عمل کا پیغام تھی۔ اسلام کی دعوت میں اتنی کشش اور جدید تہذیب کے ہاتھوں پریشان انسان کے لیے اتنا سکون ہے کہ مسلمان معاشروں کی بے عملی کے باوجود' کیا پتا کعبہ کو پاسبان ادھر سے ہی مل جائیں۔

شفیق الاسلام ' کراچی

مصری معیشت (فروری ۹۷) پر مقالے نے ورلڈ بنک جیسے اداروں کا حقیقی کردار واضح کر کے بڑی خدمت انجام دی۔ ہمارے حکمران تو ان اداروں کو قوم کا محسن ہی باور کراتے ہیں اور کشکول ہاتھ میں پکڑے ان کے دروازوں پر ہروقت موجود رہتے ہیں۔

ہدایت ولی ' پشاور

مصری معیشت پر مقالے نے برادر ملک کے حالات سے آگاہ کیا۔ دل چاہتا ہے کہ انڈونیشیا' ملائشیا' تیونس' نائیجیریا غرض دوسرے ممالک کے سیاسی ہی نہیں' معاشی' تعلیمی' معاشرتی اور عام انسانی اہمیت کے مسائل کے

بارے میں حقیقی معلومات پر تحریریں آپ کے رسالے میں پڑھنے کو ملیں۔ مغربی ذرائع سے خوشہ چینی نہ کی گئی ہو۔

ڈاکٹر محمد فصاحت علی خان، اسلام آباد

پروفیسر خورشید احمد کے اشارات (فروری ۹۷) چشم کشا بھی ہیں اور حالات کا موثر جائزہ بھی۔ "سیاست عالم" کے عنوان کے تحت آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کا کردار ایک بہت ہی بروقت اور اعلیٰ معیار کا مضمون ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ترجمان پوری تحریکی آن بان سے اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر انداز میں پیش کرنے کا فریضہ بطریق احسن انجام دیتا رہے۔

عبدالرشید بھٹی، کراچی

انسانی اعضا کی پیوند کاری (فروری ۹۷) ایک بلند پایہ تحریر ہے۔ لیکن ایک عامی کے نقطہ نظر سے، جس کی زندگی کا انحصار گردے کی پیوند کاری پر یا بصارت کا انحصار قرنیہ کی پیوند کاری پر ہو، یہ بحث کچھ زائد سی ہے۔ اس کا دل تسلیم نہیں کرتا کہ شریعت نے اس کے لیے راستہ بند کیا ہو۔

ہارون احمد، لاہور

جنرل ایوب کے دور میں معاشی مراعات حاصل کر کے بڑے بننے والوں کا ذکر (اشارات، فروری ۹۷) میں کیا گیا ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں خصوصاً جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی یہ عمل جاری رہا، اس کا ذکر بھی ضروری تھا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو نیکی کریں تو خوشی محسوس کریں اور برائی کر گزریں تو استغفار کریں"۔

(مشکوۃ المصابیح)

منشورات

۱۹۹۷ء کا اشاعتی پروگرام

ان شاء اللہ محترم خرم مراد کی درج ذیل تحریریں کتابی شکل میں پیش کی جائیں گی۔

۱- **حجِ وداع** 8 ترجمان میں شائع شدہ، جس پر انھوں نے نظرثانی کی اور پروف خوانی بھی کر چکے تھے۔

۲- **اپنی تربیت کیسے کی جائے؟** 8 زیر تحریر کتاب، تین ابواب یکجا

۳- **کلام نبوی ﷺ کی صحبت میں** 8 ۱۹۹۶ء کے اسباق شامل کر کے مکمل

۴- **اشارات** 8 ملی قومی اور دینی مسائل کے حوالے سے تین مجموعے

۵- **رسائل و مسائل** 8 ترجمان القرآن میں شائع شدہ اہم مسائل کے جوابات

۶- **احمد کے نام** 8 بھارت کی قید سے نوجوان بیٹے کے نام ایمان کے تقاضوں سے آگاہ کرنے کے لیے سلسلہ وار خطوط

۷- **تصاویر قرآنی** 8 : سید قطب کی التصویر الفنی فی القرآن کا جو حصہ نظرثانی شدہ ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے

۸- **جنگی قیدی کے خطوط** 8 بھارتی قید سے لکھے گئے خطوط۔ (نیا ایڈیشن زیر طبع)

۹- **لمعاتِ زندان** 8 ڈھاکہ میں قید کے دوران اہلیہ کے نام لکھے گئے خطوط۔ (نیا ایڈیشن زیر طبع)

۱۰- **یاد داشتیں** 8 آخری دنوں میں ابتدائے حیات سے ۱۹۷۰ء تک کے حالات کیسٹوں میں ریکارڈ کروائے تھے، انہیں تحریری شکل میں پیش کیا جائے گا۔

۱۱- **مکاتیب** 8 قابلِ اشاعت مکاتیب کی غیر معمولی تعداد ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت شائع کیے جائیں گے۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا

ہماری مطبوعات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی اعلیٰ ایڈیشن 300روپے
ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی سستا ایڈیشن 250روپے
تفہیم القرآن جلد اول
(سورہ الفاتحہ تا سورہ الانعام) 225روپے
تفہیم القرآن جلد دوم
(سورہ الاعراف تا سورہ بنی اسرائیل) 250روپے
تفہیم القرآن جلد سوم
(سورہ الکہف تا سورہ الروم) 250روپے
تفہیم القرآن جلد چہارم
(سورہ لقمان تا سورہ الاحقاف) 250روپے
تفہیم القرآن جلد پنجم
(سورہ محمد تا سورہ الطلاق) 225روپے
تفہیم القرآن جلد ششم
(سورہ التحریم تا سورہ الناس) 225روپے
تفہیم القرآن ڈیلکس سیٹ 1800روپے
تفہیم القرآن سپیشل سیٹ 1200روپے
فہم القرآن 18روپے
فہم القرآن (پارہ اول) 25روپے
تفسیر سورۃ الفاتحہ والبقرہ 45روپے
تفسیر سورۃ آل عمران 28روپے
تفسیر سورۃ النساء 35روپے
تفسیر سورۃ المائدہ 28روپے
تفسیر سورۃ الاعراف 30روپے
تفسیر سورۃ التوبہ 28روپے
تفسیر سورۃ یونس 21روپے
تفسیر سورۃ یوسف 13روپے
تفسیر سورۃ المومنون 16/50روپے
تفسیر سورۃ النحل 26روپے
تفسیر سورۃ بنی اسرائیل 28روپے
تفسیر سورۃ الانبیاء 18روپے
تفسیر سورۃ الحج 28روپے
تفسیر سورۃ النور 40روپے
تفسیر سورۃ الفرقان 18روپے
تفسیر سورۃ العنکبوت 18روپے
تفسیر سورۃ لقمان 10روپے
تفسیر سورۃ الاحزاب 30روپے
تفسیر سورۃ یٰسین 12روپے
تفسیر سورۃ الزمر 20روپے
تفسیر سورۃ الفتح 18روپے
تفسیر سورۃ الحجرات 18روپے
تفسیر سورۃ الرحمٰن 12روپے
تفسیر سورۃ الواقعہ 10روپے
تفسیر سورۃ الحدید 21روپے
تفسیر سورۃ المنافقون 10روپے
تفسیر سورۃ التحریم 10روپے
تفسیر تیسواں پارہ 60روپے
سیرت سرور عالمؐ (جلد اول) 150روپے
سیرت سرور عالمؐ (جلد دوم) 150روپے
خطبات حصہ اول (حقیقت اسلام) 24روپے
خطبات حصہ دوم (حقیقت صوم وصلوٰۃ) 15روپے
خطبات حصہ سوم (حقیقت زکوٰۃ) 6روپے
خطبات حصہ چہارم (حقیقت حج) 10/50روپے
خطبات حصہ پنجم (حقیقت جہاد) 6روپے
حقوق الزوجین 30روپے
الجہاد فی الاسلام 125روپے
خلافت و ملوکیت 90روپے
سلاجقہ 28روپے
دکن کی سیاسی تاریخ 28روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: نعیم صدیقی۔ عبدالوکیل علوی
یہودیت قرآن کی روشنی میں 84روپے
نصرانیت قرآن کی روشنی میں 75روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: سید اسعد گیلانی
حکمت تبلیغ 80روپے
دعوت و تنظیم 30روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: اختر حجازی
قوموں کے عروج و زوال پر علمی
تحقیقات کے اثرات 36روپے
استفسارات حصہ اول 75روپے
استفسارات حصہ دوم 76روپے
تفہیمات حصہ چہارم 60روپے
خطبات یورپ مجلد 90روپے
خطبات یورپ نمبر 27روپے
دارالاسلام 12روپے

عبدالکریم عابد

مولانا مودودی کے سیاسی افکار 24روپے

سید قطب شہیدؒ

معرکہ اسلام اور سرمایہ داری 24روپے

مولانا حیدر زمان صدیقیؒ

اسلامی نظریہ اجتماع 34روپے
اسلام کا نظریہ جہاد 24روپے
تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت 24روپے
عہد نبوت کے مسائل اور عصر حاضر 5روپے

مولانا جلیل احسن ندویؒ

سفینہ نجات 75روپے

سید اسعد گیلانی

رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب (مجلد) 120روپے
مشاہدات حرمین 24روپے
قرآن، رمضان اور محرم 21روپے
اسلام اور مسلم خواتین 30روپے
خطبات انبیاء 24روپے
تحریک اسلامی کی پہلی کتاب 35روپے
تحریک اسلامی کی دوسری کتاب 40روپے
تحریک اسلامی کے مراحل 10روپے
تحریک اسلامی کا تعارف 1روپے
اسلام اور سوشلزم 40روپے
دوش بدوش 46روپے
اسلامی نظریہ ادب 30روپے
امت مسلمہ سے خطاب 50روپے

ام فاروق

رسول اکرمؐ 48روپے

شبیر احمد منظر قدسی

اقامت دین ناکام، کہاں اور کیسے ہو؟ 6روپے

اختر حجازی

انسانیت کی موجودہ مشکلات اور سیرت رسولؐ 13/50روپے

ڈاکٹر محمد امین

عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون 60روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:- 7236652-7234014 پوسٹ کوڈ 54000

U.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.

